بانی : حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

مدیر : خالد سیف اللہ رحمانی

سہ ماہی مجلہ بحث ونظر حیدرآباد

شمارہ نمبر : ۱۱۳/۱۱۴	جولائی — ستمبر ۲۰۱۸ء	شوال المکرم — ذوالحجہ ۱۴۳۹ھ

مدیر

خالد سیف اللہ رحمانی

زرِ تعاون

اندرون ملک

ایک شمارہ:40روپے

سالانہ:150، بذریعہ رجسٹری:200

سہ سالہ:450، بذریعہ رجسٹری:550

بیرونِ ملک

ایشیائی ممالک کیلئے سالانہ:20امریکی ڈالر

یورپ، امریکہ، افریقہ کے لئے :

سالانہ:30امریکی ڈالر

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

Khalid Saifullah Rahmani, Baitul Hamd, H.No:16-182/1, Quba Colony, Po:Pahadi Shareef, Hyd. A.P 500005, Ph: 9989709240 E-mail: ksrahmani@yahoo.com

چیک/ڈرافٹ پر صرف:"Khalid Saifullah" لکھیں

کمپیوٹر کتابت: محمد نصیر عالم سبیلی "العالم" اُردو کمپیوٹرس، حیدرآباد، فون نمبر:9959897621 91+

فہرست مضامین

● ● ●

بسم اللہ الرحمن الرحیم

افتتاحیہ

۶ ستمبر ۲۰۱۸ء کو سپریم کورٹ کے چیف جسٹس دیپک مشرا کی سربراہی میں پانچ ججوں کی آئینی بنچ نے ہم جنسی کو غیر قانونی قرار دینے والی دفعہ ۳۷۷ کو کالعدم قرار دے کر نئی لیکن شرمناک تاریخ رقم کی ہے اور یوں ہندوستان کا شمار ان اباحیت پسند ملکوں میں ہوگیا، جہاں ہم جنسی کو قانونی جواز حاصل ہے۔

یوں تو ہم جنسی کے خلاف طویل عرصہ سے قانونی کشاکش چلی آرہی تھی، ۲۰۰۹ء میں دہلی ہائی کورٹ نے دفعہ ۳۷۷ کو تعزیری جرائم سے باہر کردیا تھا؛ لیکن سپریم کورٹ کے دو ججوں کی بنچ نے اس فیصلہ کو ختم کردیا اور دفعہ ۳۷۷ کی سابقہ حیثیت بحال کردی، ۲۷؍اپریل کو ہم سفر ٹرسٹ کے اشوک راؤ اور عارف جعفر نے دفعہ ۳۷۷ کو غیر قانونی قرار دینے کے لئے ایک درخواست دائر کی تھی، کچھ عرصہ بعد انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کی ایل بی جی ٹی المنی ایسوسی ایشن (ہم جنسوں کا گروہ) نے بھی دفعہ ۳۷۷ کے خلاف درخواست دائر کی تھی، مئی میں سپریم کورٹ نے ان درخواستوں کو سماعت کے قابل گردانا، سپریم کورٹ نے ۱۷؍جولائی کو ہی اپنا فیصلہ محفوظ کرلیا تھا اور اسی وقت ایسے اشارے دیئے تھے کہ سپریم کورٹ اس دفعہ کو کالعدم قرار دے کر ہم جنسی کو قانونی تحفظ فراہم کرنے والی ہے۔

جمہوریت میں جمہور کی سنی جاتی ہے اور قوانین سازی میں بھی جمہور کا خیال رکھا جاتا ہے؛ لیکن حیرت کی بات ہے کہ ہندوستان کی سپریم کورٹ نے جمہور کے منشاء کے مطابق بنے بنائے ایک قانون کو کالعدم قرار دے کر اس قلیل جماعت کی خواہشات کا لحاظ رکھا ہے جس کی تعداد کسی گنتی میں نہیں آتی، کیا ہندوستان کی سوا ارب آبادی میں چند سو یا ہزار افراد کی خواہشات سوا کروڑ افراد کی خواہشات کے آگے کچھ معنی نہیں رکھتیں۔

ہم جنسی نہ صرف فطرت، اخلاق اور اقدار کے منافی ہے؛ بلکہ متعدد بیماریوں کی وجہ بھی ہے، سائنسی تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ نہ صرف سوزاک اور آتشک بلکہ ایڈس جیسے مہلک مرض کا باعث بھی ہم جنسی ہے، ایسے میں جب کہ ہندوستان میں ایڈس کے مریضوں کی ایک بڑی تعداد پہلے سے موجود ہے، اس میں ہم جنسی کو قانونی

جوازفراہم کرنااس مرض کو بڑھانے کا سبب بنے گا یا گھٹانے کا؟ اور حکومت ہندایڈس کے تحفظ پر جو رقم خرچ کررہی ہے، کیا وہ نقش برآب یا پھر ریت پر محل تعمیر کرنے سے کچھ زیادہ حیثیت رکھے گا؟

دنیا بھر کے ماہرین نفسیات اس بات کو مانتے ہیں کہ بعض وجوہ سے کسی انسان میں کچھ نفسیاتی گرہ پڑ جاتی ہے اور پھر وہ ایک معتدل سلیم الفطرت انسان نہ رہ کر غیر متعدل اور فطرت کا باغی ہوجاتا ہے، وہ فطری تقاضوں کو غیر فطری طریقوں سے پورا کرنا چاہتا ہے، جیسے کوئی تشدد پسند ہوجاتا ہے، کسی کو مٹی کھانے کی عادت پڑ جاتی ہے، کوئی اجنبیوں کو دیکھ کر خوف زدہ ہوجاتا ہے، کسی کے اندر شرم وحیا معتدل حدود سے بڑھ جاتی ہے، اس طرح کے سینکڑوں نفسیاتی کیس ہوتے ہیں، اس کا حل کہیں بھی یہ نہیں ہوتا کہ اس نفسیاتی گرہ اور پیچیدگی کو جواز فراہم کیا جائے، اس پر قانونی تحفظ کی چھتری سایہ فگن کی جائے؛ بلکہ اس نفسیاتی گرہ کا علاج کیا جاتا ہے، یہی صورت حال یہاں بھی ہے، جو لوگ ہم جنس پرست ہیں وہ نفسیاتی اعتبار سے بیمار ہیں، ان کا علاج ہونا چاہئے، سائیکالوجی کے ماہرین سے استفادہ کرتے ہوئے ان کی نفسیاتی پیچیدگیوں کی وجوہات کو سمجھا جائے اور اس کا ازالہ کیا جائے، ان سب کے بجائے ہم جنسی کو قانونی جواز فراہم کرنا علاج کے بجائے مرض کو بڑھاوا دینا ہے، آج ہوسکتا ہے کہ ملک بھر میں چند ہزار اس طرح کے نفسیاتی مریض ہوں؛ لیکن قانونی تحفظ فراہم ہونے کے بعد یقیناً ان کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہوگا، جو نہ صرف ملک کے لئے بلکہ فطرت اور انسانیت کے لئے بھی ناخوشگوار ہوگا۔

گزشتہ کچھ عرصہ سے یہ بھی روایت بن گئی ہے، جب کوئی جج ریٹائرمنٹ کے قریب ہوتا ہے تو — خواہ مثبت ہو یا منفی — چاہتا ہے کہ کچھ ایسا فیصلہ رقم کرجائے کہ اس کی شہرت ہر سو ہوجائے، بالخصوص اس حلقے میں جو خود کو لبرل اور آزاد خیال کہتا ہے؛ کیوں کہ میڈیا اور وسائل شہرت پر اسی گروہ کا قبضہ ہے، موجودہ چیف جسٹس دیپک مشرا صاحب بھی ۲/اکتوبر ۲۰۱۸ء کو ریٹائر ہونے والے ہیں، آگے کچھ کہنا مناسب نہیں کہ :

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی

خالد سیف اللہ رحمانی
(بیت الحمد، شاہین نگر، حیدرآباد)

۱۰/محرم الحرام ۱۴۴۰ھ
۲۱/ستمبر ۲۰۱۸ء

• • •

نفقۂ والدین — فقہ اسلامی کی روشنی میں

مولانا محمد بن عبداللہ ندوی ☆

ادائیگی حقوق میں اللہ رب العزت کے بعد اگر کسی کا حق ہے تو وہ والدین کا ہے؛ کیوں کہ اولاد پر اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ احسان اس کے والدین ہی کا ہے کہ وہی اس کے ظہور پذیر ہونے اور پرورش کا ذریعہ ہے؛ لہٰذا اولاد کے بالغ ہونے اور کسب معاش پر قادر ہونے کے بعد اس پر اس کے والدین کی کفالت اور نفقہ کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

اسی نسبت سے شریعت اسلامی — جس میں قدم قدم پر احسان شناسی کی تعلیم دی گئی ہے — میں والدین کے نفقہ کی بڑی اہمیت وفضیلت ہے اور یہ اجر عظیم کا سبب ہے؛ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے والدین پر خرچ کرنے کی تعلیم وترغیب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے :

يَسْأَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِينَ ۔ (البقرۃ:215)

اس آیت کے نازل ہونے کا پس منظر یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا: ہم کیا خرچ کریں؟ تو اس آیت کریمہ کے ذریعہ جواب ارشاد فرمایا گیا کہ یہ چیز تو بالکل واضح ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے کوئی خاص شئے اور خاص مقدار معین نہیں ہے، جو میسر ہو، وہ خرچ کرو، ہاں، یہ سوال اہم ہے کہ کہاں خرچ کریں؟ سو آپ ﷺ فرما دیجئے کہ جو مال بھی خرچ کرنا چاہو تو سب سے پہلے ماں باپ کی خدمت میں صرف کرو، جو تمہارے وجود ظاہری کا سبب ہیں اور جس شفقت ومحبت سے انھوں نے تم کو پالا ہے، اس کا عشر عشیر بھی تم پیش نہیں کر سکتے۔(۱)

متعدد احادیث بھی والدین کے نفقہ کی اہمیت وفضیلت کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں، حضرت ابوعبداللہ الحسین ابن حرب نے ''کتاب البر والصلہ'' میں ایک روایت نقل کی ہے :

☆ شعبۂ تحقیق: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

(۱) دیکھئے: معارف القرآن، سورہ بقرہ:215، از: مولانا ادریس کاندھلویؒ۔

عَنْ مُوَرِّقٍ الْعِجْلِيِّ ، قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : هَلْ تَعْلَمُونَ نَفَقَةً اَفْضَلُ مِنْ نَفَقَةٍ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ؟ قَالُوا : اللّٰهُ وَرَسُولُهُ اَعْلَمُ ، قَالَ : نَفَقَةُ الْوَلَدِ عَلَى الْوَالِدَيْنِ اَفضل ـ (١)

حضرت مورق عجلیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا تم لوگ کسی ایسے خرچ کو جانتے ہو، جو جہاد فی سبیل اللہ کے خرچ سے بھی افضل ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: اولاد کا اپنے والدین پر خرچ کرنا سب سے افضل ہے۔

دوسری حدیث میں ہے :

عَنْ اَنَسٍ ، قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِخَمْسَةِ دَنَانِيرَ ؟ اَفْضَلُهَا دِينَارٌ اَنْفَقْتَهُ عَلٰى وَالِدَتِكَ ، وَدِينَارٌ اَنْفَقْتَهُ عَلٰى وَالِدِكَ ، وَدِينَارٌ اَنْفَقْتَهُ عَلٰى نَفْسِكَ وَ عِيَالِكَ ، وَدِينَارٌ اَنْفَقْتَهُ عَلٰى ذِي قَرَابَتِكَ ، وَاَخَسُّهَا وَاَقَلُّهَا اَجْرًا ، دِينَارٌ اَنْفَقْتَهُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ـ (٢)

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا تم کو پانچ دینار کے بارے میں نہ بتاؤں؟ ان میں سب سے افضل دینار وہ ہے، جس کو تم اپنی ماں پر خرچ کرو، پھر وہ ہے جس کو تم اپنے باپ پر خرچ کرو، پھر وہ ہے جس کو تم اپنی ذات اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کرو، پھر وہ دینار ہے جس کو تم اپنے قرابت داروں پر خرچ کرو اور سب سے کم تر اور کم اجر والا دینار وہ ہے جو تم اللہ کے راستہ میں خرچ کرو۔

سنن بیہقی میں ہے :

عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ ، قَالَ : بَيْنَمَا نَحْنُ جُلُوسٌ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذْ طَلَعَ عَلَيْنَا شَابٌّ مِنَ الثَّنِيَّةِ ، فَلَمَّا رَاَيْنَاهُ بِاَبْصَارِنَا قُلْنَا : لَوْ اَنَّ هَذَا الشَّابَّ جَعَلَ شَبَابَهُ وَنَشَاطَهُ وَقُوَّتَهُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ . قَالَ : فَسَمِعَ مَقَالَتَنَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، قَالَ : ''وَمَا سَبِيلُ اللّٰهِ إِلَّا مَنْ قَتَلَ ؟ مَنْ

(١) البر والصلة للحسين بن حرب، ص:21، حدیث نمبر:41۔

(٢) البر والصلة لابن الجوزي، ص:82، حدیث نمبر:41۔

سَعَى عَلٰى وَالِدَيْهِ فَفِي سَبِيلِ اللهِ ، وَمَنْ سَعَى عَلَى عِيَالِهِ فَفِي سَبِيلِ اللهِ ، وَمَنْ سَعَى عَلٰى نَفْسِهِ لِيُعِفَّهَا فَفِي سَبِيلِ اللهِ ، وَمَنْ سَعَى عَلٰى التَّكَاثُرِ فَهُوَ فِي سَبِيلِ الشَّيْطَانِ''۔ (۱)

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد بیٹھے ہوئے تھے، اسی اثناء میں ثنیۃ الوداع کے مقام سے ایک نو جوان آتا ہوا دکھائی دیا، جب ہم نے اسے اپنی نگاہوں سے دیکھا تو کہا: کاش یہ نو جوان اپنی جوانی، اپنی سرگرمی اور اپنی قوت کو اللہ کے راستہ میں لگاتا، جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری بات سنی تو ارشاد فرمایا: اللہ کا راستہ صرف جہاد کرنا ہی نہیں ہے؛ بلکہ جو شخص اپنے والدین کے سلسلہ میں کوشش کرے تو وہ بھی اللہ کے راستہ میں ہے، جو اپنے گھر والوں کے لئے محنت کرے، وہ بھی اللہ کے راستہ میں ہے، جو اپنی جان کے بارے میں محنت کرے؛ تا کہ وہ اس کو محفوظ اور پاک دامن رکھے تو وہ بھی اللہ کے راستہ میں ہے اور جو صرف زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کے لئے محنت کرے تو اس کی محنت شیطان کے راستہ میں ہے۔

معلوم ہوا کہ اللہ کے مختلف راستے ہیں اور والدین کی خدمت اور ان پر خرچ کرنا بھی خدا کے راستوں میں سے ایک راستہ ہے، نیز جو ثواب اللہ کے راستہ میں لڑنے اور اس میں خرچ کرنے سے ملتا ہے، وہی ثواب بلکہ اس سے بھی بڑھ کر والدین پر خرچ کرنے سے ملتا ہے۔

ان آیات واحادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ماں باپ کے نفقہ کی بڑی اہمیت وفضیلت ہے؛ البتہ فقہاء نے ماں باپ اور اولاد کے خوشحال اور تنگ دست ہونے کے اعتبار سے نفقہ کے احکام بیان کئے ہیں، جس کی بعض تفصیلات پیش کی جاتی ہیں :

نفقہ کی تعریف

نفقہ، نفوق سے مشتق ہے، اس کی جمع نفاق ونفقات آتی ہے، جس کے معنی ہلاک ہونے کے ہیں، جب کوئی چوپایہ مرجائے تو کہا جاتا ہے: ''نفقت الدابة إذا ماتت وهلكت''۔ (۲)

(۱) السنن الکبری للبیهقي، کتاب السیر، باب الرجل لایجد ماینفق: 9/43، حدیث نمبر: 17824۔

(۲) انیس الفقہاء، ص: 59، نیز دیکھئے: المصباح المنیر فی غریب الشرح الکبیر: 2/618۔

یا یہ انفاق سے مشتق ہے، جس کے معنی نکالنے کے ہیں ؛ چنانچہ علامہ ابن منظورؒ نفقہ کے معنی بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

النَّفَقة : مَا اَنفَقْت ، وَاسْتَنْفَقْتَ عَلَى الْعِيَالِ وَعَلَى نَفْسِكَ ۔ (۱)

نفقہ وہ ہے جو تم اپنی ذات اور اپنے گھر والوں پر خرچ کرو۔

فقہاء کی اصطلاح میں نفقہ اسے کہتے ہیں جو انسان کی زندگی کے لئے کفایت کرے، خواہ وہ خورد ونوش کے قبیل سے ہو یا لباس و پوشاک اور رہائش کی قبیل سے :

هي كفاية من يمونه من الطعام والكسوة والسكنى ۔ (۲)

ہشام بن عبد اللہ رازیؒ فرماتے ہیں کہ امام محمدؒ سے نفقہ کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: نفقہ خوراک، پوشاک اور رہائش ہے :

قال هشام : سألت محمدا عن النفقة فقال هي الطعام والكسوة والسكنى ۔ (۳)

نفقہ کے سلسلے میں بعض فقہاء نے مقدار ونوعیت کی تحدید کی کوشش کی ہے؛ لیکن صحیح یہ ہے کہ نفقہ وہ ہے جس سے ضروریات کی تکمیل ہوجائے اور یہ ہر زمانہ کے عرف ورواج اور زیر کفالت شخص کے حالات کے لحاظ سے مختلف ہوسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کریم کے اندر جہاں نفقہ کا ذکر کیا ہے تو اس کے ساتھ بالمعروف (مروجہ طریقہ کے مطابق) کی قید لگائی ہے، (البقرۃ:241) فقہاء نے بھی اس کی صراحت کی ہے :

وليس في النفقة عندنا التقدير لازم ، لأن المقصود من النفقة الكفاية وذلك مما يختلف فيه طباع الناس وأحوالهم ، ويختلف باختلاف الأوقات أيضاً ... (أما) في زمننا اعتبار الكفاية بالمعروف فيما يفرض في كل وقت ومكان ، والأصل فيه قوله عليه السلام لهند : خذي من مال أبي سفيان ما يكفيك ولولدك بالمعروف فيما يفرض ۔ (۴)

(۱) لسان العرب:10/358۔

(۲) الفقه الإسلامی وأدلته للزحیلی:10/7348۔

(۳) فتح القدير للكمال ابن الهمام:4/411، تاب الطلاق، باب النفقة، فصل ونفقة الأولاد الصغار على الأب۔

(۴) المحيط البرهاني في الفقه النعماني:3/528، كتاب النفقات، الفصل الأول في نفقة الزوجات۔

ہمارے نزدیک نفقہ میں تحدید ضروری نہیں ہے؛ اس لئے کہ نفقہ کا مقصود انسانی زندگی کی کفایت کرنا ہے، اور یہ ایسی چیز ہے جس میں لوگوں کے مزاج اور حالات مختلف ہوتے ہیں، اور کبھی یہ اوقات کے بدلنے سے بھی بدل جاتے ہیں، جہاں تک ہمارے زمانہ کی بات ہے تو بھلے طور پر کفایت کرنے کا اعتبار اس میں ہے جو ہر وقت اور ہر جگہ ضروری ہو، اور اس کی دلیل آپ علیہ السلام کا وہ قول ہے، جو آپ نے حضرت ہندہ سے فرمایا تھا کہ تم ابوسفیان کے مال میں سے بھلے طریقہ پر اتنا لے لو جو تیرے اور تیرے بچوں کے لئے کافی ہو۔

حدیث میں ہے کہ حضرت ہندہؓ نے آپ ﷺ سے شکایت کی کہ ان کے شوہر کم نفقہ دیتے ہیں، تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا :

خُذِي مَا يَكْفِيكِ وَوَلَدَكِ، بِالْمَعْرُوفِ ۔ (۱)

تم بھلے طریقہ پر اتنا لے لیا کرو جو تیرے اور تیرے بچوں کے لئے کافی ہو جائے۔

نفقہ کی اقسام

نفقہ دو طرح کا ہوتا ہے :

(الف) ایک وہ ہے جو انسان کی اپنی ذات سے متعلق ہے، یعنی انسان اگر کسبِ معاش پر قادر ہو تو اس پر پہلے اپنا نفقہ واجب ہوتا ہے ؛ کیوں کہ انسان کا وجود اس کے ہاتھ میں خدا کی امانت ہے اور اس امانت کی حفاظت کرنا حتی المقدور اس پر واجب ہے۔

(ب) دوسرا وہ ہے جو دوسروں سے متعلق ہے، یعنی ایک انسان پر دوسروں کا حق۔(۲)

اور یہ تین اسباب سے واجب ہوتے ہیں :

(1) ازدواجی رشتہ کی وجہ سے۔

(2) قرابت کی وجہ سے۔

(3) ملکیت کی وجہ سے۔(۳)

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب النفقات، باب إذا لم ينفق الرجل فللمرأة أن تأخذ الخ: 7/65، حدیث نمبر: 5364۔

(۲) الفقه الإسلامي وأدلته للزحيلي: 70/723۔

(۳) الدر مع الرد: 5/278۔

اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے :

ابْدَأ بِنَفْسِكَ فَتَصَدَّقْ عَلَيْهَا ، فَإِنْ فَضَلَ شَيْءٌ فَلِأَهْلِكَ ، فَإِنْ فَضَلَ عَنْ أَهْلِكَ شَيْءٌ فَلِذِي قَرَابَتِكَ ، فَإِنْ فَضَلَ عَنْ ذِي قَرَابَتِكَ شَيْءٌ فَهَكَذَا وَهَكَذَا ۔ (۱)

تم اپنی ذات سے شروع کرو اور اس پر خرچ کرو، اگر اس سے کچھ بچ جائے تو وہ تمہارے اہل وعیال کے لئے ہے، اگر ان سے بھی کچھ بچ جائے تو وہ تمہارے قرابت داروں کے لئے ہے۔

معلوم ہوا کہ انسان پر پہلے اپنا نفقہ واجب ہے پھر دوسرے لوگوں کا۔

نفقہ واجب ہونے کی شرائط

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بے شمار انسانوں کو پیدا کیا، جن میں سے بعض کو مال ودولت کی نعمت سے سرفراز کیا ہے اور بعض کو اس سے محروم رکھا ہے، کچھ کے لئے اللہ نے رزق کے دروازے کشادہ کر دیئے ہیں اور کچھ کے لئے اس کا دروازہ تنگ کر دیا :

إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۔ (الاسراء:30)

بے شک تیرا رب جس کو چاہتا ہے، رزق دیتا ہے اور جس پر چاہتا ہے تنگی کر دیتا ہے۔

چنانچہ فقہاء نے ماں باپ اور اولاد کے تنگ دست اور خوشحال ہونے کے اعتبار سے اولاد پر ان کے ماں باپ کا نفقہ واجب ہونے کی مختلف شرطیں ذکر کی ہیں، جن کی تفصیل اس طرح ہے :

(الف) احناف کے نزدیک والدین کا نفقہ واجب ہونے کے لئے دو شرطیں ہیں :

(1) والدین تنگ دست ہوں، خواہ کمانے پر قادر ہوں یا نہ ہوں۔

(2) اولاد خوشحال ہو۔(۲)

(ب) مالکیہ کے نزدیک والدین کا نفقہ واجب ہونے کی شرائط یہ ہیں :

(1) ماں باپ تنگ دست ہو۔

(2) باپ کسب معاش پر قادر نہ ہو، اگر وہ کسب معاش پر قادر ہو تو پھر اس کو کسب معاش پر مجبور کیا جائے گا اور اولاد پر اس کا نفقہ واجب نہیں ہوگا۔

---

(۱) صحیح مسلم، كتاب الزكاة، باب الابتداء في النفقة بالنفس ثم أهله ثم القرابة، 2/692، حدیث نمبر:997۔

(۲) بدائع الصنائع: 3/446۔

(3) اولاد خوشحال ہو، (خوشحال ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ کسب معاش کر رہا ہو)، اگر وہ کسی معاش سے نہ جڑا ہو تو پھر اس پر والدین کا نفقہ واجب نہیں ہوگا، اسی طرح اگر وہ کسب معاش پر قادر ہو؛ لیکن آسانی سے کام نہ مل رہا ہو تو اس کو کسب معاش پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

(4) والدین کی غربت دو عادل گواہوں یا ایک عادل گواہ اور قسم کے ذریعہ ثابت ہو۔

(5) بیوی بچوں کا نفقہ ادا کرنے کے بعد مزید بچ جاتا ہو، اگر نہ بچ پاتا ہو تو پھر اس پر والدین کا نفقہ واجب نہیں ہوگا۔(۱)

(ج) شافعیہ کے نزدیک اولاد پر والدین کا نفقہ واجب ہونے کی شرائط یہ ہیں :

(1) والدین اتنے تنگ دست ہوں کہ ان کے پاس نہ سامانِ خوردونوش ہو اور نہ ہی ایسا گھر ہو جو ان کے لئے مناسب ہو۔

(2) اولاد خوش حال ہو یا کم سے کم کمانے کے لائق ہو۔

(3) اولاد کے پاس بیوی بچوں کے ایک دن رات کا نفقہ ادا کرنے کے بعد مزید بچ جاتا ہو اور اگر نہ بچ پاتا ہو تو پھر والدین کا نفقہ واجب نہیں۔(۲)

(د) حنابلہ کے نزدیک والدین کا نفقہ واجب ہونے کی تین شرائط ہیں :

(1) والدین ایسے تنگ دست ہوں کہ ان کے پاس نہ کوئی مال ہو اور نہ جائیداد، نیز وہ کسب معاش پر بھی قادر نہ ہوں۔

(2) بیوی بچوں کا نفقہ ادا کرنے کے بعد مزید نفقہ بچ جاتا ہو، نہ بچنے کی صورت میں والدین کا نفقہ واجب نہیں ہوگا۔

(3) کسی پر نفقہ واجب ہونے کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ وہ اصحاب فروض (جن کا حصہ میراث قرآن میں متعین ہے) اور عصبات میں سے ہو، نیز وہ آزاد ہو، اور والدین اور اولاد کا دین ایک ہو، مختلف نہ ہو۔(۳)

والدین کے نفقہ میں قرابت معتبر ہے یا وراثت؟

فقہاء نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ اولاد پر ان کے والدین کا نفقہ قرابت کے اعتبار سے واجب ہوگا یا وراثت کے اعتبار سے؟ تو اس میں تین آراء ہیں :

(۱) الفقه على المذاهب الأربعة: 4/592، مواهب الجليل: 5/584۔

(۲) روضة الطالبين: 9/83-85۔

(۳) المغني لابن قدامة: 11/374-376، مسئلہ نمبر: 1382، الفقه الإسلامي وأدلته للزحيلي: 10/7348۔

(الف) پہلی رائے مالکیہ کی ہے کہ ان کے نزدیک اولاد پر ان کے والدین کا نفقہ نہ تو قرابت کے اعتبار سے واجب ہوگا اور نہ ہی وراثت کے اعتبار سے؛ بلکہ خوشحالی وتنگ دستی کے اعتبار سے واجب ہوگا؛ چنانچہ اگر کسی کے متعدد لڑکے اور لڑکیاں ہوں جن میں سے بعض خوشحال اور بعض تنگ دست ہوں تو ہر ایک پر ان کی خوشحالی وتنگ دستی کے اعتبار سے نفقہ واجب ہوگا؛ لہٰذا جو زیادہ خوشحال ہو، اس پر زیادہ نفقہ واجب ہوگا، اور جو کم خوشحال ہو، اس پر کم نفقہ واجب ہوگا، اور جو بالکل ہی تنگ دست ہو تو اس پر کچھ بھی نفقہ واجب نہیں ہوگا:

وُزِّعَتْ النَّفَقَةُ عَلَى الْأَوْلَادِ الْمُوسِرِينَ بِقَدْرِ الْيَسَارِ حَيْثُ تَفَاوَتُوا فِيهِ۔ (۱)

(ب) دوسری رائے شوافع اور حنابلہ کی ہے، ان کے نزدیک اولاد پر والدین کا نفقہ میراث کے اعتبار سے ہوگا؛ لہٰذا اگر کسی کی دو اولاد ہو، ایک لڑکا اور ایک لڑکی تو لڑکے پر بہ نسبت لڑکی کے زیادہ نفقہ واجب ہوگا؛ کیوں کہ لڑکے کا لڑکی کے مقابلہ میراث میں زیادہ حق ہے، نیز احناف کی بھی ایک رائے یہی ہے۔(۲)

و إن اجتمع ابن و بنت ، فالنفقة بينهما أثلاثا ، كالميراث ۔ (۳)

(ج) تیسری رائے احناف کی ہے کہ ان کے نزدیک والدین کا نفقہ قرابت کے اعتبار سے ہوگا؛ کیوں کہ لڑکے اور لڑکیاں دونوں قرابت میں برابر ہیں؛ لہٰذا دونوں پر والدین کا نفقہ برابر واجب ہوگا؛ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے لڑکے اور لڑکیوں کو مطلق والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے، علامہ اسروشنیؒ رقم طراز ہیں:

لأن في نفقة الأباء والأولاد يعتبر أصل القرابة ولا يعتبر الإرث وهما استويا في أصل القرابة ۔ (۴)

فقہاء کے ان اختلافات سے پرے یہ بات ذہن میں رہے کہ والدین کا نفقہ بہرحال واجب ہے اور اولاد کے لئے یہ باعث سعادت ہے؛ لہٰذا جس سے جو بن پڑے اور جتنا زیادہ ہو سکے، والدین پر خرچ کرنے کی کوشش کرے۔

خوشحال وتنگ دست اولاد پر والدین کا نفقہ

خوشحالی وتنگ دستی خدائی مصلحت ہے، وہ جس کو چاہتا ہے، بے پناہ نواز دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے محروم کر دیتا ہے؛ لہٰذا خوشحال وتنگ دست ہونا بری چیز نہیں؛ بلکہ بداخلاق اور ناشکرا ہونا بُری بات ہے۔

---

(۱) الشرح الصغير مع حاشية الصاوي:2/752۔

(۲) الفتاوى التاتارخانية:5/426۔

(۳) المغني لابن قدامة:11/384،البيان في مذهب الإمام الشافعي:11/255۔

(۴) جامع أحكام الصغار:1/139،بدائع الصنائع:3/428۔

امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق خوشحال ایسے شخص کو کہا جائے گا جو نصاب زکوۃ کا مالک ہو، یعنی کسی بھی نوعیت کا اتنا مال ہو، جو نصاب زکوۃ کی قیمت کو پہنچ جائے :

اَنْ يَمْلِكَ مَا يَحْرُمُ بِهِ اَخْذُ الزَّكَاةِ وَهُوَ نِصَابٌ وَلَوْ غَيْرَ تَامٍّ فَاضِلٍ عَنْ حَوَائِجِهِ الْاَصْلِيَّةِ ، وَهَذَا قَوْلُ اَبِي يُوسُفَ ۔ (۱)

امام محمدؒ کے قول کے مطابق کاشتکار وزمیندار کے حق میں خوشحال ایسے شخص کو سمجھا جائے گا، جس کے پاس اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ایک ماہ کی ضروریات سے زیادہ مال ہو، اور جو کاریگر ومزدور ہو کہ روز کماتا ہو اور روز کھاتا ہو تو اس کے حق میں صاحب وسعت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہر دن کا نفقہ ادا کرنے کے بعد اس کے پاس بچ رہتا ہو :

وَعَنْ مُحَمَّدٍ اَنَّهُ قَدَّرَهُ بِمَا يَفْضُلُ عَنْ نَفَقَةِ نَفْسِهِ وَعِيَالِهِ شَهْرًا إِنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ الْغَلَّةِ ، وَ إِنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ الْحِرَفِ فَهُوَ مُقَدَّرٌ بِمَا يَفْضُلُ عَنْ نَفَقَتِهِ وَنَفَقَةِ عِيَالِهِ كُلَّ يَوْمٍ ۔ (۲)

چنانچہ اگر کسی محتاج شخص کی دو اولاد ہو، ان میں سے ایک خوشحال اور دوسرا تنگ دست ہو، تو تنگ دست پر اپنی استطاعت کے بقدر نفقہ واجب ہوگا اور خوشحال پر اپنی استطاعت کے بقدر، اور اگر دونوں خوشحال ہوں؛ مگر ایک زیادہ مالدار ہو اور دوسرا کم مالدار تو ایسی صورت میں دونوں پر ان کے والدین کا نفقہ برابر واجب ہوگا :

و إن كان للفقير ابنان أحدهما فائق في الغنى والاخر يملك نصابا كانت النفقة عليهما على السواء .... إذا تفاوتا في اليسار تفاوتا يسيرا ، وأما إذا تفاوتا تفاوتا فاحشا فيجب أن يتفاوتا في قدر النفقة ۔ (۳)

احناف کے نزدیک نفقہ کے وجوب کے لئے اولاد اور والدین کا مسلمان ہونا شرط نہیں ہے؛ بلکہ مسلمان اور کافر دونوں پر والدین کا نفقہ برابر واجب ہوتا ہے؛ لہٰذا اگر کسی شخص کی دو اولاد ہو تو دونوں پر والدین کا نفقہ برابر تقسیم ہوگا :

---

(۱) ردالمحتار:5/350، بدائع الصنائع:3/447، كتاب النفقة ۔

(۲) ردالمحتار:5/351، بدائع الصنائع:3/447، كتاب النفقة ۔

(۳) الفتاوى الهندية:1/565، كتاب الطلاق، الباب السابع عشر في النفقات، الفصل الخامس في نفقة ذوي الأرحام ۔

لو كأن أحد الابنين مسلماً والاخر ذمياً كانت النفقة عليهما على السواء ۔ (۱)

یہاں اس مسئلہ کو ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بسا اوقات انسان اپنے والدین پر خرچ کرنے اور ان کا نفقہ دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا اور مجبوراً والدین کو قاضی سے رجوع ہونا پڑتا ہے تو ایسی حالت میں قاضی ان کا نفقہ ان کی اولاد پر ان کے خوشحال وتنگ دست ہونے کے اعتبار سے تقسیم کرے گا اور نفقہ نہ دینے کی صورت میں قاضی ان کے خلاف کاروائی کرے گا۔

خوشحال والدین کا نفقہ

فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر والدین خوشحال ہوں اور انھیں اپنی اولاد کی کمائی کی ضرورت نہ ہو تو ایسی صورت میں اولاد پر ان کا نفقہ واجب نہیں ہوگا :

فإن كان القريب موسراً بمال .... فلا نفقة له ۔ (۲)

البتہ اولاد کو چاہئے کہ وہ اپنے ماں باپ کی خبر گیری کرتا رہے اور وقتاً فوقتاً ان سے ان کی ضروریات کے بارے میں پوچھتا رہے؛ کیوں کہ بسا اوقات انسان کے پاس دولت ہوتی ہے؛ لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے وہ اس کے استعمال پر قادر نہیں ہوتا؛ لہٰذا ان حالات میں اولاد پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ حتی المقدور ان کی ضروریات کو پوری کرنے کی کوشش کرے۔

تنگ دست والدین کا نفقہ

خوشحال اولاد پر ان کے ماں باپ کا نفقہ واجب ہے؛ جب کہ وہ تنگ دست ومحتاج ہوں اور ان کے اندر اپنی ضروریات پوری کرنے کی صلاحیت نہ ہو؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور ان کا شکر بجالانے کا حکم دیا ہے، علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں کہ تنگ دست ماں باپ پر خرچ کرنا سب سے بہترین حسن سلوک ہے اور والدین کا شکر بجالانے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح انھوں نے بچپن میں اس کی تربیت کی، اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا، اس پر نرمی وشفقت کا معاملہ کیا، ہر شر اور قبیح چیز سے بچایا، اسی طرح اب اولاد پر ذمہ داری ہے کہ جب والدین عمر کی اس حد کو پہنچ چکے ہیں کہ وہ خود اپنا نفقہ نہیں جوڑ سکتے اور اپنی ضروریات کی تکمیل نہیں کر سکتے تو وہ ان کا نفقہ ادا کریں؛ کیوں کہ والدین کا نفقہ ادا کرنا بھی شکر میں داخل ہے۔(۳)

(۱) فتاوى قاضي خان:1 /219۔
(۲) الفقه الإسلامي وأدلته للزحيلي:7 /727۔
(۳) بدائع الصنائع:3 /449،كتاب النفقة۔

اسی طرح اگر اولاد خوشحال تو نہ ہو؛ البتہ وہ کسب معاش پر قادر ہو اور والدین تنگ دست ہوں، خواہ باپ کام پر قادر ہو یا نہ ہو، اولاد کو اس کے نفقہ پر مجبور کیا جائے گا کہ وہ کما کر اپنے والدین کا نفقہ دے :

فلو كان كل من الابن والأب كسوبا يجب أن يكتسب الابن وينفق على الأب ۔ (۱)

البتہ اگر والدین کے پاس کوئی زائد مکان یا گاڑی وغیرہ ہو، جو ان کی ضروریات زندگی سے زائد ہو؛ لیکن پھر بھی وہ تنگ دستی کی زندگی گزار رہے ہوں اور اولاد سے نفقہ کا مطالبہ کرتے ہوں تو ایسی صورت میں انھیں حکم دیا جائے گا کہ وہ اس کو بیچ کر اپنے اوپر خرچ کریں، جب یہ ختم ہوجائے تو اب اولاد پر ان کا نفقہ واجب ہوگا؛ چنانچہ علامہ ابن عابدین شامیؒ تحریر فرماتے ہیں :

لو كان للأب مسكن أو دابة فالمذهب عندنا أن تفرض النفقة على الابن إلا أن يكون في المسكن فضل نحو أن يكفيه أن يسكن ناحية منه فيؤمر الأب ببيع الفضل والإنفاق على نفسه ، ثم تفرض نفقته على ابنه ، وكذا إذا كان له دابة نفيسة يؤمر أن يبيعها ويشتري الأوكس وينفق ، ثم تفرض على الابن ۔ (۲)

اگر باپ کے پاس ایک رہائش گاہ اور ایک سواری ہو تو صحیح مذہب کے مطابق ہمارے نزدیک بیٹے پر نفقہ واجب ہوگا، الا یہ کہ اگر رہائش گاہ اتنا کشادہ ہو کہ اس کے ایک گوشہ میں رہنا اس کے لئے کافی ہو تو باپ کو زائد جگہ بیچ کر اس کی رقم اپنی ذات پر خرچ کرنے کے لئے کہا جائے گا، پھر جب وہ رقم ختم ہوجائے تو بیٹے پر اس کا نفقہ واجب ہوگا؛ اسی طرح اگر باپ کے پاس کوئی قیمتی سواری ہو تو اسے بیچ کر سستی سواری خریدنے اور اس کی رقم اپنے اوپر خرچ کرنے کو کہا جائے گا، پھر جب وہ ختم ہوجائے تو بیٹے پر باپ کا نفقہ واجب ہوگا۔

کیا باپ کو کسب معاش پر مجبور کیا جاسکتا ہے؟

کسی کے والد ایسے ہوں کہ ان کے اندر کسب معاش کی صلاحیت موجود ہو؛ مگر وہ کماتا نہیں ہو اور اولاد سے نفقہ کا مطالبہ کرتا ہو تو کیا انھیں کسب معاش پر مجبور کیا جاسکتا ہے؟ تو اس میں فقہاء کے دو نقاط نظر ہیں :

---

(۱) ردالمحتار:3/623، کتاب الطلاق، باب النفقة۔

(۲) منحة الخالق على البحر الرائق:4/228، کتاب الطلاق، باب النفقة۔

پہلا نقطہ نظر مالکیہ اور حنابلہ کا ہے کہ اگر باپ کسب معاش پر قادر ہو؛ لیکن وہ کماتا نہیں ہو اور اولاد سے نفقہ کا مطالبہ کرتا ہو تو اولاد پر اس کا نفقہ واجب نہیں؛ بلکہ اس کو کسب معاش پر مجبور کیا جائے گا؛ البتہ اولاد اس کو نفقہ دیدے تو یہ مستحسن ہے :

والراجح عند المالكية أن النفقة للوالدين على الولد لا تجب إذا قدر على الكسب وتركاه ۔ (۱)

دوسرا نقطہ نظر احناف اور شوافع کا ہے کہ اگر باپ کسب معاش پر قادر ہونے کے باوجود نہ کمائے اور اولاد سے نفقہ کا مطالبہ کرے تو اولاد پر انھیں نفقہ دینا واجب ہے اور ان کو کسب معاش پر مجبور کرنا جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ماں باپ کے ساتھ خیر خواہی اور حسن سلوک کا حکم دیا اور باپ کو کسب معاش پر مجبور کرنا خیر خواہی اور حسن سلوک کو ترک کرنا اور انھیں تکلیف میں مبتلا کرنا ہے، جو اولاد کے لئے کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے، علامہ ابن العلاء رقمطراز ہیں :

يفرض على الإبن نفقة الأب إذا كان الأب محتاجا والإبن موسرا سواء كان الأب قادرا على الكسب أو لم يكن ۔ (۲)

اگر باپ تنگ دست اور بیٹا خوشحال ہو تو بیٹے پر باپ کا نفقہ لازم ہے، خواہ باپ کسب معاش پر قادر ہو یا قادر نہ ہو۔

تنگ دست اولاد پر تنگ دست والدین کا نفقہ

شریعت میں تنگ دست ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو مالی حقوق سے متعلق عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو ادا کرنے سے قاصر ہو، خواہ وہ مالی حقوق اللہ تعالیٰ سے متعلق ہوں، یا کسی انسان سے؛ (۳) چنانچہ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ تنگ دست ایسا شخص ہے جس کے پاس کوئی مال نہ ہو، نیز وہ مالی تنگی و پریشانی سے دوچار ہونے کی وجہ سے اپنی مالی ذمہ داریوں کو ادا کرنے سے عاجز ہو۔ (۴)

---

(۱) الفقه الإسلامي وأدلته للزحيلي: 10 / 7353، القسمُ السَّادسُ: الأحوال الشّخْصيَّة، البَابُ الثَّالث: حقوق الأولاد، الفَصْلُ الخامِس: النَّفَقَات، المغني لابن قدامة: 11 / 374، الخرشي: 4 / 202۔

(۲) الفتاوی التتارخانية: 5 / 426، البيان: 11 / 247، باب نفقة الاقارب۔

(۳) احكام المعسر في الفقه الاسلامي، ص: 16۔

(۴) تفسیر قرطبی: 3 / 241۔

لہٰذا اگر کوئی تنگ دست ہو اور اس کے والدین بھی تنگ دست ہوں تو کیا اس پر اس کے والدین کا نفقہ واجب ہوگا یا نہیں؟ تو فقہاء نے مطلقاً کہا ہے کہ اگر ماں باپ اور اولاد دونوں تنگ دست ہوں تو ان میں سے کسی پر کسی کا نفقہ واجب نہیں ہوگا :

إذا كان الاب والابن معسرين لا تجب على أحدهما نفقة الآخر ۔ (۱)

البتہ اس سلسلہ کی سب سے اچھی بات علامہ شامیؒ نے اپنی کتاب ''ردالمحتار'' میں ''خلاصۃ الفتاوی'' کے حوالہ سے ذکر کی ہے اور تنگ دست کے درجات متعین کر کے اس پر اس کے والدین کا نفقہ واجب ہونے اور نہ ہونے کے احکام ذکر کئے ہیں؛ چنانچہ فرماتے ہیں کہ تنگ دست کی تین قسمیں ہیں :

(الف) ایسا تنگ دست جس کے پاس کوئی مال نہ ہو؛ البتہ وہ کسب معاش پر قادر ہو تو ایسے شخص پر مختار قول کے مطابق اس کے والدین کا نفقہ واجب ہے۔

(ب) ایسا تنگ دست جس کے پاس کوئی مال نہ ہو، نیز وہ کسب معاش پر بھی قادر نہ ہو تو ایسے شخص پر اس کے والدین کا نفقہ واجب نہیں ہوگا :

(ج) ایسا شخص جس کی کمائی اس کی غذا سے زائد ہو تو ایسے شخص کو والدین کے نفقہ پر مجبور کیا جائے گا :

الفقر أنواع ثلاثة : فقير لا مال له وهو قادر على الكسب والمختار أنه يدخل الأبوين في نفقته ، الثاني : فقير لا مال له وهو عاجز عن الكسب فلا تجب عليه نفقة غيره ، الثالث : أن يفضل كسبه عن قوته ، فإنه يجبر على نفقة البنت الكبيرة والأبوين والأجداد ۔ (۲)

نفقہ میں کون مقدم ہے، ماں یا باپ؟

ماں باپ دونوں کی کفالت کرنا اولاد کے لئے ایک اہم ذمہ داری ہے اور ان کی لوازمات وضروریات کو پورا کرنا حسن سلوک کا ایک جز ہے؛ لیکن بسا اوقات اولاد کی معاشی پوزیشن اچھی نہ ہونے کی وجہ سے اس کے لئے ماں باپ میں سے ہر ایک کو نفقہ دینا مشکل ہو جاتا ہے تو ایسی صورت میں کس کا نفقہ واجب ہوگا باپ کا یا ماں کا؟ تو اس سلسلہ میں فقہاء کے تین اقوال ہیں :

(۱) الفتاوى التتارخانية: 5/426۔

(۲) ردالمحتار: 3/622، كتاب الطلاق، باب النفقة، مطلب في نفقة الأصول۔

(الف) پہلا قول یہ ہے کہ ماں کا نفقہ واجب ہوگا؛ کیوں کہ ماں حسن سلوک کی زیادہ حقدار ہے،(۱) نیز انھیں بچہ کو اپنے پیٹ میں رکھنے، دودھ پلانے، اس کی پرورش وتربیت کرنے میں مشقتیں برداشت کرنے کی وجہ سے فضیلت حاصل ہے،(۲) ساتھ ہی ساتھ وہ ضعیف وکمزور ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ کسب معاش سے قاصر ہوتی ہے،(۳) مزید یہ کہ اللہ کے رسول ﷺ نے باپ کے مقابلہ میں ماں کا تین درجہ زیادہ بتایا ہے۔(۴)

(ب) دوسرا قول یہ ہے کہ باپ کا نفقہ واجب ہوگا؛ کیوں کہ باپ ہی نے بچپن میں اس کو تعلیم وتربیت کے زیور سے آراستہ و پیراستہ کیا، محنت ومزدوری کر کے اس کی تمام ضروریات کو پورا کیا، اس کے علاج ومعالجہ کا انتظام کیا اور اس پر اپنے پیسہ کو پانی کی طرح بہادیا، یہی وجہ ہے کہ اللہ کے رسول جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے اس صحابی (جس نے اپنے باپ کی شکایت کی کہ میرا باپ میرا مال لے لینا چاہتا ہے) سے فرمایا: تم اور تمہارا مال تمہارے باپ کا ہے،(۵) اسی طرح باپ کو تنہا اولاد پر ولایت کی فضیلت حاصل ہے۔

(ج) تیسرا قول یہ ہے کہ اولاد پر ماں باپ دونوں کا نفقہ واجب ہوگا؛ البتہ وہ یہ کرے کہ اس کے اندر ماں باپ کو جتنا نفقہ دینے کی استطاعت ہو اس کو دونوں پر برابر تقسیم کردے؛ کیوں کہ قرابت میں دونوں برابر ہیں، اس قول کو اکثر فقہاء نے ترجیح دیا ہے :

الأم أحق ؛ لأنها لا تقدر على الكسب ، وقال بعضهم : الأب أحق ؛ لأنه هو الذي يجب عليه نفقة الابن في صغره دون الأم ، وقيل يقسمها بينهما ـ (۶)

چھوٹے بچوں پر والدین کا نفقہ

والدین کے نفقہ کے سلسلہ میں بیٹا، بیٹی سب برابر ہیں؛ لہٰذا جس طرح بالغ خوشحال اولاد پر ضرورت مند ماں باپ کا نفقہ واجب ہے، ایسے ہی نابالغ اولاد پر اس کے تنگ دست ماں باپ کا نفقہ واجب ہوگا، جب کہ وہ ماں

(۱) شرح النووي على صحيح مسلم:2/312،كتاب البر والصلة والآداب۔

(۲) مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح:9/190،كتاب الآداب، باب البر والصلة۔

(۳) ردالمحتار:5/343۔

(۴) صحيح البخاري،كتاب الأدب،حدیث نمبر:5971۔

(۵) سنن أبي داود:3/289،كتاب البيوع، باب في الرجل يأكل من مال ولده،حدیث نمبر:3530۔

(۶) ردالمحتار:3/616،كتاب الطلاق، باب النفقة، مطلب الصغير والمكتسب۔

یا باپ کی میراث میں حصہ پانے کی وجہ سے یا ہدیہ وانعام میں کوئی چیز پانے کی وجہ سے خوشحال ہو گیا ہو؛ لہٰذا ماں باپ میں سے جو بھی ہو، انھیں اس بات کی اجازت ہوگی کہ وہ اپنی نابالغ اولاد کے مال سے بقدر ضرورت لے کر اپنی ذات پر خرچ کرلے :

صبي ورث من امه مالا وله أب معسر محتاج فنفقة الأب على الولد الصغير ۔ (۱)

مرتد وکافر اولاد پر والدین کا نفقہ

اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے؛ لہٰذا اگر کسی کی اولاد مرتد ہوجائے اور اسلام میں واپس نہ آئے تو شرعاً اسے قتل کرنا لازم ہے؛ لیکن چوں کہ دور حاضر میں اسلامی وغیر اسلامی ممالک میں یہ سزا نافذ نہیں ہے؛ اس لئے مرتد عام کافر کے حکم میں ہے اور کافر سے ہدیہ قبول کرنا جائز ہے؛ اسی طرح اس پر والدین کا نفقہ بھی واجب ہوتا ہے؛ لیکن چوں کہ مرتد نے ایک گھناؤنا عمل کیا ہے جس کی وجہ سے اس کے ساتھ بائیکاٹ کرنا ضروری ہے؛ لہٰذا والدین کو چاہئے کہ — اگر ممکن ہو تو — وہ ایسی اولاد سے نفقہ نہ لے؛ بلکہ مسلمانوں کو چاہئے کہ اس کے والدین کے لئے نفقہ کا انتظام کریں، علامہ شامیؒ فرماتے ہیں :

(قوله مع الاختلاف دينا) أي كالكفر والإسلام ، فلا يجب على أحدهما الإنفاق على الآخر . وفيه إشعار بأن نفقة السني على الموسر الشيعي كما أشير إليه في التكميل قهستاني ، والمراد الشيعي المفضل . بخلاف الساب القاذف فإنه مرتد يقتل إن ثبت عليه ذلك ، فإن لم يقتل تساهلا في إقامة الحدود فالظاهر عدم الوجوب ؛ لأن مدار نفقة الرحم المحرم على أهلية الإرث ، ولا توارث بين مسلم ومرتد ، نعم لو كان يجحد ذلك ولا بينة يعامل بالظاهر وإن اشتهر حاله بخلافه ، والله سبحانه أعلم ۔ (۲)

اختلاف دین — یعنی کفر واسلام — کے ساتھ دو قریبی رشتہ داروں کا نفقہ ایک دوسرے پر واجب نہیں ہوگا، اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تنگ دست سنی کا نفقہ

(۱) جامع احکام الصغار: 1/139۔

(۲) رد المحتار: 3/631، کتاب الطلاق، باب النفقة، مطلب في نفقة الأصول۔

خوشحال شیعہ پر واجب ہے جیسا کہ قہستانی نے تکمیل میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے، اور شیعہ سے وہ شیعہ مراد ہے جو حضرت علیؓ کی فضیلت کا قائل ہے، برخلاف حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو گالی دینے والے اور تہمت لگانے والے شیعہ کے؛ اس لئے کہ وہ مرتد ہے، اور اگر اس پر یہ بات ثابت ہوجائے تو اسے قتل کیا جائے گا، نیز اگر حدود قائم کرنے میں تساہل سے کام لیتے ہوئے اسی قتل نہیں کیا گیا، تو ظاہر ہے کہ اس پر نفقہ واجب نہیں ؛ اس لئے کہ رحم ذی محرم کے نفقہ کا مدار اہلیت ارث پر ہے، اور مسلمان اور مرتد کے درمیان وراثت جاری نہیں ہوتا ، ہاں اگر وہ اس کا انکار کردے اور کوئی دلیل نہ ہوتو ظاہر پر عمل کیا جائے گا، اگر چہ اس کی حالت اس کے برخلاف مشہور ہو۔

باپ کا نکاح

اسلام نے قومی وملی مسائل سے لے کر شخصی وانفرادی مسائل کو جس حسن وخوبی کے ساتھ حل کیا ہے، اس کی نظیر دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ملتی؛ چنانچہ انفرادی مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ شادی بیاہ کا ہے کہ اس کے ذریعہ انسان شیطانی وسوسہ اور اس کے شرور وفتن سے محفوظ ہوجاتا ہے، نیز اس سے انسان کے نفس کو راحت اور طبیعت کو سکون حاصل ہوتا ہے؛ کیوں کہ میاں بیوی کے آپس میں مل جل کر بیٹھنے اور آپسی گفت وشنید سے ایک دوسرے کو تقویت ملتی ہے اور عبادت میں بھی لطف آتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَمِنْ آيَاتِهِ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا ۔ (۱)

اور اسی کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے واسطے تمہاری جنس کی بیویاں بنائیں؛ تاکہ تم کو ان کے پاس آرام ملے۔

بہر حال اگر کسی کے باپ کو نکاح کی حاجت ہو، مگر وہ اس پوزیشن میں نہ ہو کہ وہ خود اپنا نکاح کر لے تو کیا اس کا نکاح کرانا اولاد کی ذمہ داری ہوگی؟ تو اس سلسلہ میں دو رائیں ہیں :

(الف) پہلی رائے مالکیہ اور حنابلہ کی ہے، ان کے نزدیک اولاد پر باپ کی شادی کرانا واجب ہے، اگر اس کو نکاح کی حاجت ہو، اور اس کے مہر کی ذمہ داری بھی اولاد ہی پر ہے، نیز اگر باپ کے لئے ایک بیوی ناکافی ہو یا بیٹے نے جس عورت سے باپ کا نکاح کرایا تھا، اس کا انتقال ہوجائے تو باپ کی دوسری شادی کرانا بھی بیٹے پر واجب ہے :

---

(۱) الروم:21۔

إعفافه بالتزويج بزوجة واحدة ، وكذا عند المالكية والحنابلة بأكثر من زوجة إن لم يحصل الإعفاف بواحدة ۔ (۱)

اوراگر باپ نے اس بیوی کوطلاق دے دیا،جس سے اولاد نے اس کا نکاح کرایا تھاتو اب اولاد پر باپ کی دوسری شادی کراناواجب نہیں :

و إن زوجه ... فطلق الزوجة .... لم يكن عليه أن يزوجه ... ثانيا ؛ لأنه فوت ذلك على نفسه . و إن ماتت ، فعليه إعفافه ثانيا لأنه لا صنع له في ذلك ۔ (۲)

(ب) دوسری رائے حنفیہ اور شافعیہ کی ہے کہ اگر باپ کو نکاح کی ضرورت ہوتو خوشحال اولاد پر باپ کا نکاح کراناواجب ہے :

إن احتاج الأب إلى زوجة والابن موسر وجب عليه أن يزوجه ۔ (۳)

نیز اگراولاد نے باپ کا نکاح کرادیا؛لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد باپ کی اس بیوی کا انتقال ہوگیا یا دونوں میں آپسی خلفشار کی وجہ سے جدائی ہوگئی،توکیا اب باپ کی دوسری شادی کرانا بیٹے پرواجب ہے؟تواس سلسلہ میں شوافع کے یہاں دواقوال ہیں :

(الف) بیٹے پر باپ کا دوسرا نکاح کراناواجب نہیں؛ کیوں کہ بیٹے پر ایک ہی بار باپ کا نکاح کراناواجب تھا،سواس نے انجام دے دیا۔

(ب) بیٹے پر باپ کا دوسرا نکاح کراناواجب ہےاور یہی قول صحیح ہے :

وان ماتت الزوجة ففيه وجهان : أحدهما : لا يلزمه اعفافه ثانيا ؛ لأنه إنما يجب عليه إعفافه مرة وقد فعل ، والثاني : يلزمه وهو الأصح لأنه لاصنع له في تفويت ذلك ۔ (۴)

---

(۱) الفقه الإسلامي وأدلته للزحيلي: 10 / 7425،القسمُ السَّادسُ: الأحوال الشّخْصيَّة،البَابُ الثَّالث: حقوق الأولاد،الفَصْلُ الخامِس: النَّفَقَات،المغني لابن قدامة: 8 / 217،كتاب النفقات۔

(۲) المغني لابن قدامة: 8 / 217،كتاب النفقات۔

(۳) الجوهرة النيرة على مختصر القدوري: 2 / 92،كتاب النفقات،كتاب المجموع شرح المهذب: 20 / 148۔

(۴) المجموع شرح المهذب: 18 / 312،كتاب النفقات، باب نفقة الاقارب۔

فقہاء نے جس طرح ضرورت مند باپ کے نکاح کے مسئلہ پر بحث کی ہے، ٹھیک اسی طرح اس مسئلہ پر بھی بحث کی ہے کہ اگر کسی کی ماں مطلقہ یا بیوہ ہوجائے اور انھیں نکاح کی ضرورت ہو؛ لیکن وہ کسی سبب سے اس کا اظہار اپنی اولاد یا خاندان کے کسی فرد سے نہ کرے تو خاندان کے افراد اور اولاد کو چاہئے کہ وہ ان کی عفت وعصمت کی حفاظت کی خاطر ان کا نکاح ان سے پوچھ کر کردے، اور اگر وہ خود اظہار کردے کہ انھیں نکاح کی ضرورت ہے تو پھر کوئی مسئلہ نہیں :

أما الأم فإن إعفافها إنما هو تزويجها إذا طلبت ذلك ۔ (۱)

جہاں تک مطلقہ ماں کی بات ہے تو اس کی عفت وعصمت کی حفاظت اس میں ہے کہ اس کی شادی کرادی جائے، اگر وہ اس کی خواہش مند ہو۔

البتہ ماں کے نکاح کے بعد اولاد پر اس کے نفقہ کی ذمہ داری نہیں ہے؛ بلکہ اس کے شوہر پر واجب ہے :

من إيجاب نفقة الأم على الولد إذ لم تكن متزوجة ؛ لأنها على الزوج ۔ (۲)

سوتیلی ماں کا نفقہ

باپ نے اپنی طبعی ضرورت وخدمت کے لئے نکاح کرلیا، یا اولاد نے خود ان کا نکاح کرادیا، یا پہلے ہی سے باپ کے پاس دو یا تین بیویاں ہوں؛ لیکن ان کے اندر اپنی بیویوں کا نفقہ ادا کرنے کی استطاعت نہ ہو تو کیا اولاد پر باپ کی بیویوں (سوتیلی ماں) کا نفقہ واجب ہے؟ تو اس سلسلہ میں ائمہ اربعہ کے درمیان قدرے اختلاف ہے :

مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک اگر باپ کے اندر اپنی بیویوں کا نفقہ دینے کی استطاعت نہ ہو؛ البتہ سوتیلی مائیں خوشحال ہوں تو اولاد پر ان کا نفقہ واجب نہیں؛ لیکن اگر اولاد خوشحال ہو، اور باپ وسوتیلی مائیں تنگ دست ہوں تو اولاد پر باپ کی تمام بیویوں (سوتیلی ماؤں) کا نفقہ واجب ہے۔

إذا كان العفاف يحصل بواحدة و إلا تعددت النفقة على الولد ۔ (۳)

حنفیہ کے نزدیک سوتیلی ماں کے نفقہ کے سلسلہ میں دو روایتیں ہیں :

---

(۱) المغني لابن قدامة: 8/216، كتاب النفقات، فصل يلزم الرجل إعفاف أبيه ۔

(۲) البحر الرائق: 4/224، كتاب الطلاق، باب النفقة ۔

(۳) حاشية الدسوقي: 2/523، باب أسباب النفقة، فصل في بيان النفقة بالملك والقرابة، المغني لابن قدامة: 11/380، كتاب النفقات، فصل يلزم الرجل إعفاف أبيه، المجموع شرح المهذب: 20/148، كتاب النفقات، باب نفقة الاقارب ۔

(الف) اولاد پر سوتیلی ماں کا نفقہ اس صورت میں واجب ہے؛ جب کہ باپ کسی مرض میں مبتلا ہو اور کمانے کی صلاحیت نہ ہو، نیز انھیں خدمت کی ضرورت ہو؛ کیوں کہ اس صورت میں سوتیلی ماں باپ کی خادمہ کے درجہ میں ہے اور باپ کے خادم کا نفقہ اولاد کے ذمہ واجب ہوتا ہے؛ لہٰذا اس کا بھی نفقہ واجب ہوگا :

وعليه نفقة زوجة أبيه أي في رواية ، وفي أخرى إن كان الأب مريضاً أو به زمانة يحتاج للخدمة ۔ (۱)

لیکن اگر باپ کی متعدد بیویاں ہوں تو اولاد پر تمام کا نفقہ واجب نہیں ہوگا؛ بلکہ اولاد کے ذمہ باپ کی صرف ایک بیوی کا نفقہ واجب ہوگا؛ لہٰذا اولاد ایک بیوی کا نفقہ باپ کے حوالہ کردے، اب باپ پر یہ لازم ہوگا کہ وہ اس نفقہ کو اپنی تمام بیویوں پر تقسیم کردے :

و إن كان للأب زوجتان أو أكثر لم يلزم الابن إلا نفقة واحدة ويدفعها إلى الأب وهو يوزعها عليهن ۔ (۲)

والدین کیلئے خادم کا نظم

قرآن وحدیث کے مطالعہ اور شریعت مطہرہ کے مزاج ومذاق کو سامنے رکھنے اور اس میں غور وفکر کرنے سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ والدین کے نفقہ میں وہ تمام بنیادی ضروریات شامل ہیں، جو اصل میں ہر زمانہ کے عرف وحالات کے لحاظ سے ضروری شمار کی جاتی ہیں اور اس کی قطعی تحدید ممکن نہیں ہے؛ چنانچہ والدین کی تمام بنیادی ضرورتوں کو فراہم کرنے کے بعد اگر انھیں خادم کی ضرورت ہو تو خادم کا نظم کرنا اور اس کے اخراجات کو برداشت کرنا اولاد کے فرائض میں داخل ہے، حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں کہ :

ماں باپ کی خدمت کرتے رہنا شریعت اسلامی کے ایک اہم ترین واجبات میں سے ہے، تہذیب فرنگ کی طرح شریعت اسلامی کا یہ فتوی نہیں کہ لڑکا جب عاقل اور بالغ اور صاحب اختیار ہو جائے تو بیوی کو ساتھ لے کر اپنا الگ گھر بار کرلے، اور بوڑھے ماں باپ سے اگر تعلق رکھے بھی تو محض دور کا اور ضابطہ کا، بڑے ہو کر ماں باپ سے بے تعلقی خاص وصف حیوانی ہے۔ (۳)

---

(۱) ردالمحتار: 3/616، کتاب الطلاق، باب النفقة، مطلب الصغير والمكتسب۔

(۲) الجوهرة النيرة على مختصر القدوري: 2/92، كتاب النفقات۔

(۳) تفسیر ماجدی: 3/27۔

غرض کہ اولاد پر ماں باپ کی خدمت ہر حالت میں ضروری ہے؛ البتہ بسا اوقات انسان کسی مجبوری کی وجہ سے ضرورت مند ماں باپ کی خود خدمت کرنے سے عاجز ہوتا ہے، تو ان حالات میں اولاد کو چاہئے کہ وہ اپنے والدین کے لئے خادم کا نظم کردے اور اس کے اخراجات کو برداشت کرے؛ کیوں کہ یہ اس کے ذمہ واجب ہے، نیز ان کا اپنے والدین کے لئے خادم کا نظم کرنا ان کی جانب سے خدمت سمجھا جائے گا، علامہ شامیؒ خادم کے نظم اور اس کے نفقہ کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں :

إذا احتاج أحدهما لخادم وجبت نفقته كما وجبت نفقة المخدوم ۔ (۱)

اور اگر ماں باپ میں سے کسی ایک کو خادم کی ضرورت ہو تو (اس کے لئے خادم کا نظم کرنا) اور اس کے اخراجات کو برداشت کرنا اولاد کے ذمہ ہے، جیسا کہ اس پر مخدوم کے نفقہ کی ذمہ داری ہے۔

والدین اور چھوٹے بھائی بہن کا نفقہ

نفقہ کے مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ اگر والدین تنگ دست ہو اور اس کے اندر اپنے اور اپنی اولاد کے نان ونفقہ کی استطاعت نہ ہو؛ البتہ بعض اولاد صاحب ثروت وخوشحال ہو، تو خوشحال اولاد پر ماں باپ اور چھوٹے تنگ دست بھائی بہن کا نفقہ واجب ہے، اگر انھوں نے نفقہ دینے سے انکار کیا تو ان کو نفقہ کے لئے مجبور کیا جائے گا :

الأب إذا كان فقيرا معسرا ، أو له أولاد صغار محاويج ، وابن كبير موسر يجبر الابن على نفقة أبيه ونفقة أولاده الصغار ۔ (۲)

والدین اور اہل وعیال کا نفقہ

اللہ تعالیٰ بسا اوقات ایک شخص کو اتنا عطا کر دیتا ہے کہ اس کے لئے اپنی اور دوسروں کی کفالت آسان ہو جاتی ہے؛ لیکن بعض دفعہ وہ انسان کو اتنا ہی نوازتا ہے، جتنا اس کے اور اس کی اولاد کے لئے کافی ہو؛ چنانچہ اس مناسبت سے فقہاء نے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے کہ اگر اولاد کے اندر صرف اپنی اور اپنے اہل وعیال کے نفقہ کی استطاعت ہو، مگر ساتھ ہی اس کے والدین بھی ہوں جو کہ تنگ دست وضرورت مند ہوں اور انھیں نفقہ کی ضرورت ہو، نیز باپ کے اندر کسب معاش کی صلاحیت نہ ہو، تو اس صورت میں کس کا نفقہ واجب ہوگا؟ والدین کا یا اہل وعیال کا؟

(۱) رد المحتار: 3/616، كتاب الطلاق، باب النفقة، مطلب في نفقة زوجة الأب۔

(۲) الفتاوى الهندية: 1/565، كتاب الطلاق، الباب السابع عشر في النفقات، الفصل الخامس في نفقة ذوي الأرحام۔

تو اس سلسلہ میں فقہاء فرماتے ہیں کہ نفقہ کے زیادہ حقدار اس کے اہل وعیال ہیں؛ البتہ اولاد کو چاہئے کہ وہ اپنے والدین کو بھی اپنے اہل وعیال کے ساتھ رکھے اور جو کچھ اپنے اہل وعیال کو کھلائیں، انھیں بھی کھلائیں، علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں :

و إن كان الوالد لا يقدر على عمل أو كان زمناً وللابن عيال كان على الابن أن يضم الأب إلى عياله وينفق على الكل ۔ (۱)

اگر باپ کسی کام پر قادر نہ ہو یا معذور ہو اور بیٹا صاحب عیال ہو تو بیٹے پر لازم ہوگا کہ وہ باپ کو اپنے اہل وعیال کے ساتھ رکھے اور تمام پر خرچ کرے۔

نیز ابوبکر بن علی بن محمد الحدادی فرماتے ہیں :

و إن كان للرجل أب وابن صغير وهو لا يقدر إلا على نفقة أحدهما فالابن أحق وقيل يجعل بينهما و إن كان له أبوان وهو لا يقدر على نفقة أحد منهما فإنهما يأكلان معه ما أكل ۔ (۲)

اگر کسی شخص کو والد اور چھوٹا بچہ ہو اور وہ ان میں سے ایک ہی کا نفقہ دینے پر قادر ہو تو بچہ نفقہ کا زیادہ حقدار ہے، اور اگر ماں باپ دونوں ہوں اور ان میں سے کسی کا نفقہ دینے کی استطاعت نہ ہو تو جو کچھ خود کھائے والدین بھی اس کے ساتھ کھائیں گے۔

اگر اولاد ماں باپ کو اپنے اہل وعیال میں شامل کرنے سے انکار کردے تو قاضی اس کو مجبور کرے گا کہ وہ ان کو اپنے معاش میں شامل کرے اور ان کو اپنے اہل وعیال کے ساتھ رکھے؛ البتہ قاضی اس کو ایک متعین مقدار میں ماں باپ کو نفقہ دینے پر مجبور نہیں کرسکتا ہے :

فالقاضي يجبره على أن يدخل الأب في كسبه ويجعله كأحد عياله ولا يجبره أن يعطي له شيئا على حدة ۔ (۳)

کیوں کہ والدین کو اہل وعیال کا ایک حصہ شمار کرنے میں اولاد کا کم نقصان ہے، بہ نسبت اس کے کہ ان کے لئے ایک متعین مقدار میں نفقہ دیا جائے؛ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

---

(۱) البحر الرائق: 4/223، کتاب الطلاق، باب النفقة۔

(۲) الجوهرة النيرة على مختصر القدوري: 2/92، کتاب النفقات۔

(۳) منحة الخالق على البحر الرائق: 4/223، کتاب الطلاق، باب النفقة۔

طعام الاثنين كافي الثلاثة ، وطعام الثلاثة كافي الأربعة ۔ (۱)
دوافراد کا کھانا تین افراد کے لئے کافی ہے، اور تین افراد کا کھانا چار کے لئے کافی۔

اسی مناسبت سے علامہ شامیؒ یہ نکتہ بیان فرماتے ہیں کہ جب لڑکا اپنے والد کو اپنے اہل وعیال میں شامل کرلے گا تو اسے کم نقصان ہوگا؛ اس لئے کہ چار افراد کے کھانے کو جب پانچ افراد پر تقسیم کیا جائے تو ان میں سے ہر ایک کو ضرر فاحش نہیں ہوگا، بہ نسبت اس کے کہ اگر ایک ہی آدمی کے کھانے میں دوسرے شخص کو بھی شامل کردیا جائے تو اس میں زیادہ نقصان ہے :

إذا أدخله في طعام عياله يقل الضرر ؛ لأن طعام الأربعة إذا فرق على الخمسة لا يتضرر كل واحد منهم ضررا فاحشا أما إذا أدخل الواحد في طعام الواحد يتفاحش الضرر ۔ (۲)

غائب اولاد کے مال میں تصرف

بلا اجازت کسی کے مال میں تصرف کرنا جائز نہیں ہے، بالخصوص اس وقت جب کہ صاحب مال غائب ہو، یا کسی سفر وغیرہ پر ہو؛ بلکہ یہ ایک معاشرتی فریضہ ہے کہ معاشرے کا ہر فرد اپنے مال کی حفاظت کرے، اس کو ضائع وبرباد ہونے سے بچائے اور اس کی اجازت کے بغیر اس کا مال استعمال نہ کرے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

لا يحل مال امرئ مسلم إلا عن طيب نفس ۔ (۳)
کسی بھی مسلمان کا مال استعمال کرنا جائز نہیں مگر اس کے طیب خاطر (اس کی اجازت) کے ساتھ۔

البتہ ماں باپ اس سے مستثنیٰ ہیں اگر وہ محتاج ہوں اور انھیں نفقہ کی ضرورت ہو؛ تا کہ وہ اپنی گزر بسر کرسکیں اور ان کے پاس ان کی اولاد کا مال ہو؛ لیکن وہ گھر پر موجود نہ ہوں؛ بلکہ سفر پر ہوں یا کسی دور دراز علاقہ میں مقیم ہوں اور انھوں نے اپنے والدین کے نفقہ کا نظم نہ کیا ہو یا نفقہ کا انتظام تو کیا ہو؛ مگر وہ جلد ختم ہو گیا ہو یا ضائع ہو گیا ہو اور اولاد سے اجازت لینے میں یا اس کا انتظار کرنے میں جان کا خطرہ ہو یا پریشانیوں سے دو چار ہونے کا اندیشہ ہو تو ان حالات میں والدین کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی غیر موجود اولاد کے مال میں سے بقدر کفایت لے لیں اور اپنے نفقہ کا نظم کرلیں؛ کیوں کہ اولاد کا مال بھی والدین ہی کا مال ہے، رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا :

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الأطعمة، باب: طعام الواحد يكفي الاثنين، حدیث نمبر: 5392۔
(۲) منحة الخالق على البحر الرائق: 4/223، كتاب الطلاق، باب النفقة۔
(۳) سنن الدارقطني: 3/424، كتاب البيوع، حدیث نمبر: 2886۔

أولادكم من طيب أكسابكم فكلوا من أموال أولادكم هنيئا ۔ (۱)

تمہاری اولاد تمہاری کمائی کا ایک پاکیزہ حصہ ہیں، پس تم اپنی اولاد کی کمائی سے مزے سے کھاؤ۔

اسی وجہ سے فقہاء اسلام فرماتے ہیں کہ اگر تنگ دست والدین اپنی اولاد کے مال میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کردیں تو وہ ضامن نہیں ہوں گے، یعنی ان سے مال وصول نہیں کیا جائے گا؛ چنانچہ علامہ ناصر الدین سمرقندیؒ فرماتے ہیں :

و إن كان للابن الغائب مال في يد أبويه فأنفقا منه لم يضمنا ؛ لأنهما قدرا على جنس حقهما ۔ (۲)

اگر غائب بیٹے کا مال ماں باپ کے پاس رکھا ہو، اور انھوں نے اس میں سے خرچ کرلیا تو وہ ضامن نہیں ہوں گے؛ اس لئے کہ وہ اپنے حق کی جنس کو وصول کرنے پر قادر ہیں۔

اگر ماں باپ کے پاس غائب بیٹے کی منقولہ اشیاء ہوں تو اس کو نفقہ کے لئے بیچنا جائز ہے؛ لیکن اگر غیر منقولہ اشیاء ہوں جیسے جائیداد ہو تو اسے بیچنا جائز نہیں ہے :

و إذا باع أبوه متاعه في نفقته جاز عند أبي حنيفة رحمه الله و إن باع العقار لم يجز عند الكل وعند ابي يوسف و محمد لايجوز بيع العروض أيضا لعدم الملك ۔ (۳)

اور جب باپ بیٹے کی اشیاء کو اپنے نفقہ کے سلسلہ میں فروخت کردے تو امام اعظمؒ کے نزدیک جائز ہے اور اگر غیر منقولہ جائیداد کو فروخت کرے تو تمام فقہاء کے نزدیک یہ ناجائز ہے، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک غیر منقولہ سامان بھی فروخت کرنا جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ وہ اس کا مالک نہیں ہے۔

(۱) تفسير القرطبي: 3/321، نیز دیکھئے: سنن أبي داود: 3/289، كتاب البيوع، باب في الرجل يأكل من مال ولده، حدیث نمبر: 3530۔

(۲) الفقه النافع: 2/703، كتاب النفقات۔

(۳) الفقه النافع: 2/703، كتاب النفقات۔

علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں کہ اگر باپ کے پاس بیٹے کی جائداد یا کوئی تجارتی سامان ہو اور اس نے قاضی کے سامنے دعوی پیش کیا کہ اس کی اولاد نے اس کو نفقہ نہیں دیا ہے؛ لیکن قاضی کو سبب معلوم نہ ہو کہ اولاد نے نفقہ کیوں نہیں دیا ہے؟ یا سبب تو معلوم ہو؛ لیکن باپ کی حاجت کا علم نہ ہو، یا باپ کی حاجت کا علم تو ہو؛ لیکن اس کا احتمال ہو کہ اولاد نے اس کا نفقہ ادا کردیا ہے تو ان تمام صورتوں میں غائب اولاد کی منقولہ یا غیر منقولہ اشیاء کو بیچنا جائز نہیں؛ البتہ اگر قاضی نے کسی مصلحت کے تحت ان چیزوں کو بیچ ہی دیا اور رقم باپ کے حوالہ کردی تو باپ ضامن نہیں ہوگا؛ اس لئے کہ وہ قاضی کے حکم سے اس پر مالک ہوگیا ہے؛ البتہ اس بات کا خیال رہے کہ اگر جائیداد وغیرہ کو بیچنے سے غائب اولاد کو زیادہ نقصان کا اندیشہ ہو تو بقدر ضرورت اس میں سے بیچ کر والد کو دیا جائے اور اگر زیادہ نقصان کا اندیشہ نہ ہو تو پھر قاضی یہ معاملہ باپ ہی کے سپرد کردے اور کہہ دے کہ اگر تم اپنے دعوی میں سچے ہو تو پھر بقدر کفاف اس کو تم اپنی ذات پر صرف کرلو، میں اس سلسلہ میں کوئی حکم جاری نہیں کرسکتا :

> واحترز بالأب أيضا عن القاضي ؛ لأنه ليس له البيع عند الكل لا في العروض ولا في العقار ولا في النفقة ولا في سائر الديون ، يريد به إذا لم يكن السبب معلوما للحاكم ، و إن كان معلوما ولكن حاجة الأب لم تكن معلومة ، أو إن كانت معلومة إلا أنه يحتمل أن الابن أعطاها النفقة وفي هذه الوجوه كلها لا يبيع ؛ لأنه لو باع القاضي وصرف الثمن إليه لا يكون ذلك الثمن مضمونا عليه ؛ لأنه قبض بأمر القاضي فيتضرر به الغائب ، فلذا لا يبيعه القاضي ، ولكن يفوض الأمر إلى الأب ويقول له إن كنت صادقا فيما تدعي و إلا فلا آمرك بشيء وهو على هذا الوجه لا يتضرر الغائب اهـ۔ (۱)

● ● ●

(۱) البحر الرائق:4/232،كتاب الطلاق، باب النفقة۔

مہر — احکام ومسائل

مفتی شاہد علی قاسمی ☆

''مہر'' عورت کی عزت وعصمت اور عفت و پاکدامنی کا عوض نہیں ہے؛ بلکہ اس کی عصمت کے احترام کا اظہار ہے، بالفاظ دیگر ایک اعزازیہ (Honorarium) ہے، جو ایک شوہر اپنی بیوی کو پیش کرتا ہے، شریعت کا منشاء ہے کہ جب کوئی شخص بیوی کو اپنے گھر لائے تو اس کا مناسب اکرام کرے اور اسے ایسا ہدیہ پیش کرے جو اس کے اعزاز و اکرام کے مناسب ہو۔

مہر کی حیثیت دین کی ہے، جس کی ادائیگی ضروری ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً'' (النساء: ۴) یعنی عورتوں کو ان کا مہر دے دو، اور دَین کے بارے میں اُصول ہے کہ جب تک صاحب دَین معاف نہ کردے اس کی ادائیگی ضروری ہوتی ہے، اس لئے اگر بیوی خوش دلی سے معاف نہ کرے تو شوہر پر اس کی ادائیگی ضروری ہوتی ہے، عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ عقد نکاح کے وقت مہر تو ضرور مقرر کیا جاتا ہے؛ لیکن اس کی ادائیگی نہیں ہو پاتی ہے، تصور یہ ہے کہ اگر کبھی میاں بیوی کے درمیان علاحدگی ہوجائے تو مہر ادا کیا جائے گا، ورنہ اس کی ادائیگی کی ضرورت نہیں ہے، اگر شوہر موت کے قریب ہو تو بیوی پر دباؤ ڈال کر مہر معاف کرالیا جاتا ہے، مہر کے سلسلہ میں عام لوگوں کا یہ رویہ شریعت کے مزاج کے خلاف ہے، اگر شوہر مہر کی ادائیگی کی نیت نہ رکھے تو وہ گنہگار رہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے مہر مقرر کیا اور اس کی ادائیگی کا ارادہ نہیں ہے تو وہ زانی ہے، بعض روایات میں ہے کہ قیامت کے دن وہ خدا کے حضور ایک زناکار کی حیثیت سے پیش ہوگا۔(۱)

اگر شوہر نے مہر ادا نہ کیا ہو اور بیوی نے معاف بھی نہ کیا ہو اور شوہر کا انتقال ہوجائے تو اس کے ترکہ سے بیوی اگر چاہے تو پہلے اپنا مہر وصول کرلے، پھر ترکہ تقسیم کرنے والے، اسی طرح اگر بیوی کا پہلے انتقال ہوجائے تو اس کی دوسری املاک وجائیداد کی طرح شوہر کے ذمہ مہر بھی بیوی کا ترکہ سمجھا جائے گا اور اس کی تقسیم بھی وارثین کے درمیان ان کے حصۂ شرعی کے مطابق ہوگی۔

☆ معتمد تعلیم: المعهد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

(۱) مجمع الزوائد: ۴/ ۲۸۴، باب فیمن نوی أن یؤدی صداق امرأته۔

مہر کی دو قسمیں ہیں: ''مہر معجّل''اور ''مہر مؤجل'' مہر معجّل ایسے مہر کو کہا جاتا ہے جس کی فوری ادائیگی کی بات طے ہوگئی ہو، خواہ شوہر مجلس عقد میں دے، یا بیوی کو پہلی ملاقات کے وقت دے، اگر مہر معجّل کی بات طے ہوئی ہو اور وہ مجلس عقد یا پہلی ملاقات میں بیوی کو مہر نہ دے تو بیوی کے لئے شرعاً گنجائش ہے کہ وہ شوہر کو اپنے اوپر قدرت نہ دے، جب تک شوہر مہر ادا نہ کردے، مہر مؤجل ایسے مہر کو کہا جاتا ہے جس میں ادائیگی کے لئے مہلت دی گئی ہے، ایسی صورت میں بیوی کے لئے یہ بات درست نہیں ہوگی کہ وہ مہر وصول ہونے تک اپنے آپ کو شوہر سے روکے رکھے؛ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ جب میاں بیوی میں سے کسی کا انتقال ہوجائے یا کسی وجہ سے نکاح ختم ہوجائے تب ہی ''مہر مؤجل'' کی ادائیگی لازم ہو؛ بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ مہلت کی تاریخ متعین کرلی جائے، جیسے پانچ سال، دس سال وغیرہ؛ کیوں کہ ''مؤجل''ایسی مہلت کو کہا جاتا ہے جس کی تاریخ متعین کردی گئی ہو۔

مہر کی کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ مقدار کیا ہے؟ اس سلسلہ میں شریعت کا مزاج یہ ہے کہ مہر کی مقدار اتنی کم نہ ہو کہ وہ بے معنی ہوکر رہ جائے اور نہ اتنی زیادہ کہ شوہر ادا کرنے پر قادر نہ ہوسکے، اس لئے درمیانی راستہ اختیار کرنا چاہئے، بہتر تو یہ ہے کہ اس عورت کے خاندان میں اس جیسی عورتوں کا جو مہر رکھا گیا ہے، اسی مقدار میں اس کا بھی متعین کیا جائے، ہر عورت کا اصل حق یہی ہے، اسی وجہ سے اگر مہر متعین کئے بغیر نکاح ہوگیا ہو اور میاں بیوی کو یکجائی بھی ہوچکی ہو تو بیوی کو ''مہر مثل'' ملتا ہے، یعنی اس عورت کے خاندان میں اس جیسی عورتوں کا جو مہر ہو، اسی کے برابر اس عورت کا مہر سمجھا جائے گا؛ لیکن اگر عورت مہر مثل سے کم لینے پر خوش دلی سے راضی ہو یا شوہر اپنی رضامندی سے زیادہ دینا چاہے تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے، شریعت نے مہر کی زیادہ سے زیادہ مقدار متعین نہیں کی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَّ اٰتَیْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَیْـًٔا'' (النساء:۲۰) نیز حضرت حسن بن علیؓ کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے ایک خاتون سے نکاح کیا تو اسے سو باندیاں مہر میں دیں اور ہر باندی کے ساتھ ایک ہزار درہم بھی۔(۱)

مہر کی کم سے کم مقدار کے بارے میں ائمہ کرام کے درمیان اختلاف ہے، احناف کے نزدیک اس کی کم سے کم مقدار دس درہم ہے، ارشاد نبوی ہے: ''لا مهر أقل من عشرة دراهم'' دس درہم کی مقدار ۲ر تولہ ۷ر۱-۲ ماشہ ہے، (واضح ہو کہ یہ تولہ ۱۱۵۴۴ر گرام کا ہے) گویا گرام کے اعتبار سے کم از کم مہر ۶۱۸ء۳۰ر گرام ہونا ضروری ہے؛ لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں ہے کہ مہر اتنا ہی رکھنا چاہئے؛ بلکہ یہ تو ادنیٰ حد ہے کہ غریب سے

(۱) مجمع الزوائد: ۴ر ۲۸۴، باب الصداق۔

غریب انسان بھی جس کو ادا کرنے پر قادر ہو سکے، عہد رسالت کی طرف لوٹیں اور ازواجِ مطہرات کا مہر دیکھیں تو بالعموم ان اُمہات المومنین کا مہر پانچ سو درہم تھا،(۱) اور صاحبزادیٔ رسول ﷺ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کا مہر چار سو اَسّی درہم تھا، جو ڈیڑھ کیلو ۳۰ گرام اور ۹ رسوملی گرام (۱۵۳۰ء۹۰۰) ہوتا ہے۔

صاحبزادیٔ رسول سیدہ حضرت فاطمہؓ کے مہر کو ''مہر فاطمی'' کہا جاتا ہے، مہر فاطمی کے بارے میں یہ سمجھنا کہ یہ شرعی مہر ہے، اس سے کم یا اس سے زیادہ غیر شرعی ہے درست نہیں ہے، ہاں اگر لڑکی اور لڑکا والے آپس میں مہر فاطمی اس لئے طے کریں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی مقرر کی ہوئی بابرکت مقدار ہے اور ظاہر سنت کی پیروی مقصود ہو تو یقیناً یہ جذبہ بہت مبارک اور مستحسن ہے اور اس میں اجر وثواب ملنے کی بھی توقع ہے؛ لیکن اس سے کم یا زیادہ مہر کو ناپسندیدہ کہنا بالکل غلط ہے، مہر مقرر کرتے ہوئے کوشش کرنی چاہئے کہ سونا یا چاندی میں رکھا جائے؛ کیوں کہ سکہ رائج الوقت کی قوت خرید میں روز بہ روز گراوٹ آتی رہتی ہے، جب کہ سونا کی قیمت میں کافی استحکام ہے، اس لئے سونا اور چاندی میں مہر متعین کرنا عورت کے مفاد میں ہے، نیز ان دونوں دھاتوں میں مہر مقرر کرنا سنت سے قریب تر بھی ہے؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ازواج مطہراتؓ، بناتِ طاہراتؓ اور حضرات صحابیاتؓ کا مہر سونا یا چاندی کے سکوں میں طے کیا جاتا تھا۔

نکاح درست ہونے کے لئے مہر کا پہلے سے مقرر ہونا ضروری نہیں ہے، اگر مہر مقرر کئے بغیر نکاح کا عقد کیا جائے تو نکاح منعقد ہو جاتا ہے، تاہم بہتر بات یہی ہے کہ مہر طے کر کے نکاح کی مجلس منعقد کی جائے، اگر مہر متعین ہو اور میاں بیوی کے درمیان تنہائی ہو چکی ہو تو شوہر پر مکمل مقررہ مہر واجب ہوگا، اگر دونوں کی تنہائی سے پہلے طلاق کی نوبت آجائے تو اسے آدھا مہر ملے گا اور اگر یکجائی ہو چکی ہو اور مہر متعین نہیں تھا تو پھر بیوی کو ''مہر مثل'' ملے گا، مہر مثل سے مراد اس عورت کے خاندان کی عورتوں کا عمومی مہر ہے جو عمر، تمول، خوبصورتی، عقل واخلاق اور کنوار پن میں اس کے برابر ہو، اور اگر مہر مقرر نہ ہو نیز میاں بیوی میں یکجائی بھی نہ ہوئی ہو اور علاحدگی کی نوبت آجائے تو بیوی کو متعہ ملے گا، شوہر پر واجب ہے کہ وہ بیوی کو ''متعہ'' دے، متعہ کی مقدار متعین نہیں ہے، مرد کی حیثیت اور گنجائش پر منحصر ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ'' (البقرۃ:۲۳۶) احناف کے یہاں قول مشہور یہی ہے کہ متعہ میں کم از کم ایک جوڑا کپڑا دیا جائے، امام ابوحنیفہؒ کے استاذ امام حماد کی رائے تھی کہ عورت کے خاندانی مہر کی نصف رقم دے دی جائے۔(۲)

---

(۱) مشکوٰۃ:۲/۲۷۷۔

(۲) احکام القرآن للجصاص:۱/۴۳۴۔

بہر حال! بیوی کے لئے مقرر کیا جانے والا مہر کوئی فرضی اور رسمی چیز نہیں ہے؛ بلکہ یہ ایک دینی فریضہ ہے، جس کی ادائیگی ضروری ہے، اگر بیوی خوش دلی سے معاف نہ کرے تو شوہر پر اس فریضہ کی ادائیگی لازم رہے گی، یہ بڑی ناانصافی کی بات ہوگی کہ شوہر پوری زندگی اس سے بے فکر رہے اور جب بستر مرگ پر آجائے تو بیوی پر دباؤ ڈلوا کر مہر معاف کرالے۔

وباللہ التوفیق وھو المستعان .

● ● ●

فتنۂ قادیانیت اور علماء اسلام کے فتاویٰ

مولانا محمد احسان الحق مظاہری ☆

شریعت کی اصطلاح میں مرتد وہ ہے، جو ہدایت سے بہرہ ور ہونے کے بعد پھر کفر والحاد کی طرف چلا جائے، دنیا کے قانون میں ملک کے باغی افراد یا جماعت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی، ان کو ملک کا دشمن اور بغاوت کرنے والا بتا کر قتل و پھانسی کی سزا دی جاتی ہے، اسی طرح اس دین متین سے پھر جانا اسلام سے بغاوت کے مترادف ہے، اس لئے دارالاسلام میں رہتے ہوئے جو لوگ ارتداد کے مرتکب ہوں، مذہب اسلام میں ان کی سزا قتل ہے: **من بدل دینه فاقتلوه**،(۱) ''جو دین سے پھر جائے، اس کو قتل کر دو''۔

اُم المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> کسی مسلمان کا خون مباح نہیں ہوسکتا، مگر تین چیزوں میں سے ایک کے پائے جانے کی وجہ سے، شادی شدہ ہونے کے باجود زنا کرے، مسلمان ہونے کے بعد کفر کو اختیار کرے، یا کسی کی جان لی ہو اور بطور قصاص قتل کیا جائے۔(۲)

نیز ائمہ اربعہ اور فقہاء کا مرتد کے قتل پر اتفاق ہے؛ چنانچہ شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ فرماتے ہیں:

> قد اتفق الأئمة على أن من ارتد عن الإسلام وجب قتله وعلى أن قتل الزنديق واجب وهو الذى يسر الكفر ويتظاهر بالإسلام ، وعلى أنه إرتد أهل بلد قد تلوا صارت اموالهم غنيمة ۔ (۳)

☆ استاذ: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

(۱) بخاری، حدیث نمبر: ۶۹۲۲۔

(۲) نسائی: ۲/ ۱۴۷۔

(۳) المیزان الکبریٰ: ۲/ ۱۷۱، بحوالہ: قاموس الفقہ: ۲/ ۷۵۔

ائمہ کا اتفاق ہے کہ مرتد اور زندیق کا قتل واجب ہے، زندیق وہ شخص ہے جو اسلام کا اظہار کرے اور بباطن کافر ہو، نیز ائمہ کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ جب پوری آبادی مرتد ہوجائے تو اس سے قتال کیا جائے اور اس کے اموال، مالِ غنیمت ہوں گے۔

اسلامی عہد میں تواتر کے ساتھ اس پر عمل ہوتا رہا ہے، یہاں مسئلہ اس قسم کے لوگوں کا ہے، جو اپنے کو مسلمان بھی کہتے ہیں؛ جب کہ وہ اپنے عقائد کے لحاظ سے اصلاً کافر ہیں، یہ لوگ مسلمانوں میں شامل مانے جائیں گے یا اہل کتاب کے حکم میں ہوں گے، یا عام کفار والا حکم ہوگا؟ یہ تو ظاہر ہے کہ عقائد کفریہ و فاسدہ کی وجہ سے مسلمانوں میں ان کا شمار نہ ہوگا اور نہ ہی ان کا شمار اہل کتاب میں ہوگا؛ بلکہ وہ عام کفار کے حکم میں ہوں گے، فقہاء نے ایسے لوگوں کو زندیق سے تعبیر کیا ہے اور زندیق کی تعریف اس طرح کی گئی ہے :

هو الذی یظهر الإسلام ویسر بالکفر وهو المنافق وکان یسمی فی عصر النبی صلی الله علیه وسلم منافقاً ویسمی الیوم زندیقاً ۔ (۱)

جو بظاہر اسلام پر ہو اور بباطن کفر پر رضامند ہو، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایسے لوگ منافق کہے جاتے تھے اور آج زندیق کہے جائیں گے۔

اسلامی حکومت میں اہل کتاب اور کھلے ہوئے مشرکین و کفار قابل برداشت ہیں؛ لیکن ایسے منافقین جو بظاہر اسلام کے دعویدار ہوں اور بباطن کفر، وعمل کفر پر رضامند ہوں، ناقابل برداشت ہیں؛ اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ کھلے مرتد کی توبہ تو قبول کی جائے گی: ''کل مسلم ارتد فتوبته مقبولة''۔(۲)

لیکن ایسے زندیق شخص کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی :

وقتل الزندیق بعد الإطلاع علیه بلا إستتابة وهو من اسر الکفر وأظهر الاسلام ۔ (۳)

علامہ ابن عابدین شامیؒ نے تھوڑی تفصیل یوں کی ہے :

إذا أخذ الساحر أو الزندیق المعروف الداعی قبل توبته ثم تاب لم تقبل توبته ویقتل ولو اخذ بعدها قبلت ۔ (۴)

(۱) قاموس الفقہ: ۲/ ۲۵۷، بحوالہ: مجمع الفقہ الحنبلی: ۱/ ۴۴۴۔

(۲) شامی: ۶/ ۲۵۷۔

(۳) الشرح الصغیر: ۴/ ۴۳۸، بحوالہ: قاموس الفقہ: ۲/ ۲۵۷۔

(۴) درمختار: ۶/ ۳۸۴۔

اگر کوئی زندیق عقائد فاسدہ کی دعوت دیتا ہو اور وہ پکڑا جائے تو اس کی توبہ نا قابل اعتبار ہے؛ بلکہ قتل کر دیا جائے گا اور پکڑے جانے سے پہلے زندیق توبہ کر لے تو اس کی توبہ قبول کی جائے گی اور قتل سے بچ جائے گا۔

لیکن امام مالکؒ، احمد بن حنبلؒ کے نزدیک مطلقاً اور امام شافعیؒ کی ایک روایت یہ ہے کہ کسی حال میں زندیق کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی: ''أنه لا تقبل توبته مطلقاً''۔(۱)

جو کھلا ہوا مرتد ہوش وحواس کی حالت میں اپنی رضامندی سے کلمۂ کفر بولا ہو، یا ان اُمور کا ارتکاب کیا ہو جسے فقہاء ارتداد قرار دیتے ہیں، ان کے بارے میں لکھا ہے کہ :

من ارتد عرض الحاکم علیه الإسلام استحبابا علی المذهب لبلوغه الدعوة وتکشف شبهة ویحبس وجوبا وقیل ندباً ثلاثة ایام یعرض علیه الإسلام فی کل یوم منها ان استمهل ای طلب المهلة و إلا قتله من ساعته ۔ (۲)

تین دنوں تک ایسے شخص کو قید میں رکھا جائے گا، مستحب طریقہ یہ ہے کہ اس درمیان اس پر اسلام پیش کیا جائے اور ان کے شبہات دُور کئے جائیں اور وہ تائب ہو جائے تو ٹھیک ہے، ورنہ اس مدت کے بعد اسے قتل کر دیا جائے گا۔

یہ حکم مرد کے لئے ہے، عورت اگر مرتدہ ہوگئی تو وہ قتل نہیں کی جائے گی؛ بلکہ قید کر دی جائے گی اور جب تک توبہ نہ کرے سخت سرزنش کی جائے گی؛ یہ احناف کے نزدیک ہے؛ لیکن جمہور کے نزدیک مرتدہ عورت بھی قتل کر دی جائے گی :

وکذا تقتل المرأة المرتدة عند الجمهور العلماء غیر الحنفیة۔(۳)

ان تفصیلات کے بعد عرض ہے کہ اُمتِ مسلمہ کا متفقہ فیصلہ ہے کہ قادیانی گروہ اپنے عقائد کفریہ وفاسدہ کی بنیاد پر مرتدوں، زندیقوں کا گروہ ہے جو اپنے عقائد کفریہ پر اسلام کا لیبل لگا کر دنیا بھر میں نام نہاد اسلامک مشن وغیرہ کے نام سے ان کی ترویج واشاعت میں مصروف وسرگرم ہیں، جن کا حقیقی اسلام سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

(۱) الموسوعۃ الفقہیہ: ۵۰/۲۴۔

(۲) درمختار: ۳۵۹/۶-۳۶۱۔

(۳) الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۱۷۶/۶۔

الغرض قادیانیوں کو نہ مطلق مرتدین کے حکم میں رکھا جائے گا اور نہ اہل کتاب میں ان کا شمار ہوگا، گرچہ مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا :

لیکن اگر اس کے ماں باپ یا ان میں سے کوئی ایک مرزائی تھا تو یہ اہل کتاب کے حکم میں ہے۔(۱)

دوسری عبارت یوں ہے :

نسلی مرزائی اسی طرح اہل کتاب کے حکم میں ہے، جس طرح یہود ونصاریٰ۔(۲)

غالباً حضرت مفتی صاحبؒ کے نزدیک نسلی مرزائی کے اہل کتاب میں سے ہونے کی بنیاد یہ ہو کہ قرآن کریم میں 'الکتاب' سے اہل کتاب مراد ہیں؛ چوں کہ یہ لوگ کتب سماویہ کو بھی مانتے ہیں، اس لئے نسلی قادیانی کو اہل کتاب کے حکم میں رکھا گیا؛ لیکن اس سلسلہ میں فقیہ العصر، مفسر قرآن حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب بہت جستجو وتحقیق کے بعد بہ انشراحِ قلب یوں رقم طراز ہیں :

اس مسئلہ پر فقہی جزئیات کے مطالعہ اور بعض اہل علم کی رائے کے مطالعہ سے اب دل جس بات پر مطمئن ہے وہ یہی ہے کہ نسلی قادیانی کو بوجہ ان کی زندیقیت کے عام کفار ومشرکین ہی کے حکم میں رکھا جائے گا، نہ کہ اہل کتاب کے حکم میں اور جو مسلمان قادیانیت میں گئے ہوں (العیاذ باللہ) وہ تو سراسر مرتد ہی ہیں۔(۳)

اب ذیل میں قادیانیوں کے تعلق سے علماءِ اسلام کے اقوال وفتاویٰ، سماجی وقومی اور ملی حیثیت سے اختصار کے ساتھ دفعہ وار پیش کئے جاتے ہیں :

فتاویٰ اور تاریخی فیصلے

● جب کسی آدمی کے بارے میں معلوم ہوجائے کہ یہ قادیانی ہے، کفر وزندقہ اور ارتداد پھیلانے میں مصروف وسرگرم ہے تو ان کے ساتھ تجارت میں شریک ہونا، تقریبات میں شرکت کرنا، یا ان کو دعوت دینا، ان کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا، کھنا پینا، ان کے گھر آنا جانا، دوستانہ تعلقات رکھنا اور ان کے ساتھ مسلمانوں جیسا سلوک کرنا قطعی حرام ہے اور ایمانی غیرت کے خلاف ہے؛ لہٰذا ایسے شخص کا مکمل بائیکاٹ کرنا اور کسی قسم کا میل جول نہ رکھنا لازم ہے۔

(۱) کفایت المفتی:۱/ ۳۲۲۔

(۲) کفایت المفتی:۱/ ۳۲۵۔

(۳) تفصیل کے لئے دیکھئے: حاشیہ قاموس الفقہ:۲/ ۲۵۷۔

● مسلمان عورت سے قادیانی مرد کا نکاح یا قادیانی عورت سے مسلمان مرد کا نکاح حرام ہے، اگر ان جیسے لوگوں میں عقد مناکحت ہوتا ہے تو یہ نکاح باطل ہے، اگر پہلے سے میاں بیوی مسلمان تھے اور (العیاذ باللہ) شوہر قادیانی ہوگیا تو نکاح فسخ (ختم) ہوجائے گا، اس کی مسلمان بیوی کو جائز نہیں کہ اس کے گھر رہے اور میاں بیوی کا تعلق اس سے باقی رکھے۔

● اسی طرح اگر کوئی جان بوجھ کر قادیانی عورت سے نکاح کرتا ہے تو نکاح کرنے والے مسلمان پر اپنے ایمان کی تجدید لازم ضروری ہے اور اگر ناواقفیت میں نکاح ہوجائے اور پھر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ عورت قادیانی ہے تو مرد پر لازم ہے کہ اس قادیانی عورت کو مسلمان کرے، بصورت دیگر فوراً علاحدگی اختیار کرلے اور اپنے اس فعل پر توبہ کرے۔

● ایسا ہی قادیانیوں کے ارتداد اور زندقہ کی وجہ سے ان کا ذبیحہ مسلمان کے لئے حرام ہے۔

● قادیانی غیر مسلم زندیق ہیں، ان کی نماز جنازہ جائز نہیں؛ چنانچہ قرآن کریم میں اس کی صاف ممانعت موجود ہے :

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ۔ (التوبۃ:۸۴)

اور نماز نہ پڑھ ان میں کسی پر جو مرجائے اور نہ کھڑا ہو اس کی قبر پر، وہ منکر ہوئے اللہ سے اور اس کے رسول سے اور وہ مر گئے نافرمان۔

نیز ان کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا جائز نہیں؛ بلکہ اسے کتے کی طرح گڑھے میں ڈال دیا جائے گا :

و إذا مات أو قتل علی ردته لم یدفن في مقابر المسلمین ولا أهل ملة و إنما یلقی في حفرة کالکلب ۔ (۱)

اسی طرح علامہ شامیؒ نے لکھا ہے :

ولا یغسل ولا یکفن ولا یدفع الی من انتقل إلی دینهم ۔ (۲)

اس مرتد مردہ کو نہ غسل دیا جائے گا نہ کفن اور نہ اسے ان کے ہم مذہب لوگوں کے سپرد کیا جائے گا۔

---

(۱) الاشباہ والنظائر:۲۹۱، کتاب السیر۔

(۲) ردالمحتار:۳/۱۳۴، باب صلاۃ الجنازہ۔

● اگر لاعلمی میں یا چپکے سے قادیانیوں نے اپنا مردہ یا گاؤں کے لوگوں نے قادیانی مردہ کو مسلمانوں کے قبرستان میں گاڑ دیا تو قبرستان سے اس لاش کا اُکھاڑنا واجب ہے اور اس کی چند وجوہ ہیں، اول یہ کہ مسلمانوں کا قبرستان مسلمان کے لئے وقف ہے، کسی غیر مسلم کا دفن کیا جانا غصب ہے اور جس مردہ کو غصب کی زمین میں دفن کیا جائے، اس کا اُکھاڑنا لازم ہے، جیسا کہ کتبِ فقہ میں اس کی تصریح موجود ہے؛ کیوں کہ کافر مرتد کی لاش جب کہ غیر محل میں دفن کی گئی ہو لائق احترام نہیں؛ چنانچہ امام بخاریؒ نے صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ میں باب باندھا ہے: ''**باب هل ينبش قبور مشركى الجاهلية**'' اس کے تحت یہ حدیث نقل کی ہے کہ مسجد نبوی ﷺ کے لئے جو جگہ خریدی گئی، اس میں کافروں کی قبریں تھیں: ''**فامر النبى صلى الله عليه وسلم بقبور المشركين فنبشت**'' پس آنحضرت ﷺ نے مشرکین کی قبروں کو اُکھاڑ پھینکنے کا حکم فرمایا؛ چنانچہ وہ اُکھاڑی گئیں، اگر قادیانی مردہ کے اکھاڑ پھینکنے میں کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا ہو، پھر بھی اس سلسلہ میں جدوجہد کرنا ضروری ہے، ورنہ اس گاؤں کے سارے مسلمان گنہگار رہوں گے۔

● مسلمانوں پر لازم ہے کہ ایسی قوم جو شعائر دین اور مسلمانوں کے تشخصات وامتیازات کی آڑ میں اسلام کی بیخ کنی کرے، مسجد بنانے کی ہرگز اجازت نہ دیں، جیسا کہ عہد رسالت میں منافقین (جو بظاہر مسلمان تھے اور اندرونی طور پر اسلام کی مخالفت کرتے تھے) نے مدینہ منورہ میں ایک مسجد بنائی؛ تاکہ اسے اپنے خیالات وافکار کی اشاعت کا مرکز بنائیں اور اسلام پر قدغن لگائیں، جب اللہ کے آخری نبی ﷺ کو اس کی اطلاع ملی تو اللہ کے حکم سے آپ ﷺ نے منافقین کی مسجد منہدم کرادی اور قرآن نے ایسی مسجد کو مسجد ضرار سے تعبیر کیا ہے:

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّ تَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ، لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ۔ (۱)

اور جن لوگوں نے مسجد بنائی کہ اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں اور کفر کریں اور اہل ایمان کے درمیان تفرقہ ڈالیں اور اللہ، رسول سے لڑنے والوں کے لئے ایک کمین گاہ بنائیں اور یہ لوگ زور کی قسم کھا کر کہیں گے کہ ہم نے بھلائی کے سوا کسی چیز کا ارادہ نہ کیا اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ قطعاً جھوٹے ہیں، آپ اس میں کبھی قیام نہ کیجئے۔

---

(۱) التوبۃ: ۱۰۷-۱۰۸۔

اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ قادیانی لوگ جو منافقین سے بھی بدتر ہیں، ان کا خفیہ ناپاک منصوبے کے تحت اسلام کو منہدم کرنے، مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ ڈالنے، عقائد کفریہ کی تبلیغ کرنے کے لئے ان کی مسجد کا حکم یہ ہے کہ ان کی مسجد یعنی 'معبد' مسجد ضرار کہلائے گی اور اسلامی علامات کے استعمال کی اجازت نہیں دی جائے گی، مسلمانوں کو ان کے خلاف پُرامن انداز سے آواز اُٹھانے اور اس پر روک لگانے کا پورا حق حاصل ہوگا؛ لہٰذا قادیانیوں کا اپنی عبادت گاہ کو مسجد کہنا، لکھنا، مسجد کے مینار ومحراب بنانا، اپنے میگزین وکتابوں میں کعبۃ اللہ اور گنبد خضریٰ کی مقدس تصاویر شائع کرنا، حتیٰ کہ اپنا کلمہ اسلام کی طرح استعمال کرنا، اذان دینا، اسلامی نقطۂ نظر سے ہرگز درست نہیں اور مسلمانوں کو کسی بھی حال میں قبول نہیں کرنا چاہئے؛ کیوں کہ علماء اسلام نے متفقہ طور پر اس جماعت کو کافر، اسلام کا باغی اور دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا ہے۔

● اسی طرح مخصوص القاب، خطاب یا اوصاف کا استعمال بھی ناجائز ہے، جیسے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے صحابی یا خلیفہ کے علاوہ کسی شخص کو امیر المومنین، خلیفۃ المسلمین، خلیفۃ المومنین، صحابی یا رضی اللہ عنہ، کے طور پر منسوب کرنا یا مخاطب کرنا، اسی طرح آپ ﷺ کی ازواج مطہرات کے علاوہ کسی خاتون کو اُم المومنین کے طور پر منسوب کرنا اور آپ ﷺ کے خاندان (اہل بیت) کے کسی فرد کے علاوہ کسی شخص کو اہل بیت کے طور پر منسوب کرنا جائز نہیں ہے۔(۱)

● خاتم الانبیاء والمرسلین حضرت محمد ﷺ نے ارشاد فرمایا: إن امتی لا تجتمع علی ضلالة، (۲) ''میری اُمت گمراہی پر ہرگز جمع نہیں ہوگی''۔

پوری اُمتِ مسلمہ کا اتفاق واجماع ہے کہ قادیانی کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہیں، عالم اسلام میں جو فتاویٰ دیئے گئے ہیں ان کا شمار تو مشکل ہے، تاہم برصغیر کے مختلف مکاتبِ فکر، مختلف حلقوں اور اداروں نے جو فتاویٰ شائع کئے، ان کے اسماء یہ ہیں: دیوبند، سہارنپور، تھانہ بھون، رائے پور، دہلی، کلکتہ، بنارس، لکھنؤ، آگرہ، مرادآباد، لاہور، امرتسر، لدھیانہ، پشاور، راولپنڈی، ملتان، ہوشیارپور سیالکوٹ، گوجرانوالہ، گجرات، حیدرآباد دکن، بھوپال، رامپور، بریلی اور بدایوں کے تمام دینی مراکز علماء نے باتفاق قادیانیوں کو خواہ قادیانی احمدی ہوں یا لاہوری، کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا ہے۔(۳)

---

(۱) از: دارالافتاء المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

(۲) ابن ماجہ، ابواب الفتن، حدیث نمبر: ۳۹۵۰۔

(۳) دیکھئے: فتاویٰ تکفیر قادیان: ۱۹۲ تا ۲۰۶۔

یہی نہیں بلکہ عالم اسلام کے ملی، قومی، اصلاحی، تنظیموں اور انجمنوں کے سربراہوں نے علاحدہ علاحدہ شریعت محمدیہ کے باغی مرزا غلام احمد قادیانی کو اس کی تاویلات فاسدہ، ہفوات باطلہ اور عقائد مخصوصہ کے سبب کافر، دجال اور اسلامی دائرہ سے خارج قرار دیا ہے۔(۱)

رابطہ عالم اسلامی کی تاریخی قرارداد

رابطہ عالم اسلامی کے تحت مکہ مکرمہ میں مؤرخہ: ۶-۱۰/اپریل ۱۹۷۴ء مطابق ۱۳۹۴ھ کو ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں مراقش سے انڈونیشیا تک کی مسلم آبادیوں کی ۱۴۴ رتنظیموں کے ذمہ داران نے شرکت کی اور فتنۂ قادیانیت کے مذہبی و سیاسی پہلو پر مکمل غور وخوض کے بعد اس کے اسلام دشمن اثرات کو زائل کرنے کے لئے جو قرارداد منظور کی، وہ قادیانیت کے کفر والحاد ہونے پر اجماع اُمت کی حیثیت رکھتی ہے، ملاحظہ ہو اس تاریخی قرارداد کا ترجمہ :

> قادیانیت ایک باطل فرقہ ہے جو اپنے اغراض خبیثہ کی تکمیل کے لئے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلام کی بنیادوں کو ڈھانا چاہتا ہے، اسلام کے قطعی اُصولوں سے اس کی مخالفت ان باتوں سے واضح ہے :
>
> (الف) اس کے بانی کا دعویٰ نبوت کرنا۔
>
> (ب) قرآنی آیات میں تحریف۔
>
> (ج) جہاد کے باطل ہونے کا فتویٰ دینا۔

قادیانیت کی داغ بیل برطانوی سامراج نے رکھی اور اس نے اسے پروان چڑھایا، وہ سامراج کی سرپرستی میں سرگرم عمل ہے، قادیانی اسلام دشمن قوتوں کا ساتھ دے کر مسلمانوں کے مفادات سے غداری کرتے ہیں اور ان طاقتوں کی مدد سے اسلام کی بنیادی عقائد میں تحریف وتبدیل اور بیخ کنی کے لئے کئی ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں، مثلاً :

(الف) دنیا میں مساجد کے نام پر اسلام دشمن طاقتوں کی کفالت سے ارتداد کے اڈے قائم کرنا۔

(ب) مدارس، اسکولوں، یتیم خانوں اور امدادی کیمپوں کے نام پر غیر مسلم قوموں کی مدد سے ان کی مقاصد کی تکمیل۔

(ج) دنیا کی مختلف زبانوں میں قرآن کریم کے تحریف شدہ نسخوں کی اشاعت وغیرہ۔

---

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ''علماء اسلام کے فتاوے اور فیصلے''، مجلس تحفظ ختم نبوت، دارالعلوم دیوبند۔

ان خطرات کے پیش نظر کانفرنس میں طے کیا گیا کہ :

(۱) دنیا بھر میں ہر اسلامی تنظیم اور تمام دینی جماعتوں کا فریضہ ہے کہ وہ قادیانیت اور اس کی ہر قسم کی اسلام دشمن سرگرمیوں کی ان کے معابد، مراکز، یتیم خانوں وغیرہ میں کڑی نگرانی کریں اور ان کی تمام در پردہ سیاسی سرگرمیوں کا محاسبہ کریں اور اس کے بعد ان کے پھیلائے ہوئے جال، منصوبوں، سازشوں سے بچنے کے لئے عالم اسلام کے سامنے انھیں پوری طرح بے نقاب کیا جائے۔

(۲) اس گروہ کے کافر اور خارج از اسلام ہونے کا اعلان کیا جائے۔

(۳) اور یہ کہ اس کی وجہ سے انھیں مقامات مقدسہ حرمین شریفین وغیرہ میں داخلہ کی اجازت نہیں دی جاسکے گی، مسلمان قادیانیوں سے کسی قسم کا معاملہ نہیں کریں گے، اقتصادی، معاشرتی، اجتماعی، عائلی وغیرہ، ہر میدان میں ان کا بائیکاٹ کیا جائے گا۔

(۴) کانفرنس تمام اسلامی ملکوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ قادیانیوں کی ہر قسم کی سرگرمیوں پر پابندی لگائیں، ان کے تمام وسائل اور ذرائع کو ضبط کیا جائے، اور کسی قادیانی کو کسی اسلامی ملک میں کسی قسم کا حصہ دارانہ عہدہ نہ دیا جائے۔

(۵) قرآن مجید میں قادیانیوں کی تحریفات سے لوگوں کو خبردار کیا جائے اور ان کے تمام تراجم قرآن کا شمار کر کے لوگوں کو ان سے متنبہ کیا جائے اور ان تمام تراجم کی ترویج واشاعت کا انسداد کیا جائے۔(۱)

اب اخیر میں پیش ہے اسلامی فقہ اکیڈمی، مکہ مکرمہ کے پہلے سیمینار کا تیسرا فیصلہ جس میں مدعیانِ نبوت اور منکرین ختم نبوت کے کفر وارتداد پر مہر لگائی گئی ہے، جو رسالہ ہذا کے خلاصہ کے طور پر درج کیا جارہا ہے :

اسلامی فقہ اکیڈمی مکۃ المکرمہ کے سیمینار میں قادیانی جماعت کا جائزہ لیا گیا، جس کا ظہور اُنیسویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں ہوا تھا اور جسے ''احمدیہ'' بھی کہتے ہیں، اجلاس نے اس مذہب کا مطالعہ کیا جس کی دعوت اس کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی (۱۸۷۶ء سے) نے دی ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ وہ نبی ہے، اس پر وحی آتی ہے، وہ مسیح موعود ہے اور یہ کہ پیغمبر اسلام سیدنا محمد بن عبد اللہ ﷺ پر نبوت ختم نہیں ہوئی ہے، (جیسا کہ قرآن کریم

(۱) قادیانی فتنہ اور ملت اسلامیہ کا موقف: ۱۰۰، روزنامہ الندوہ، ۱۴/ اپریل ۱۹۷۴ء۔

اور سنت کی صراحت کے مطابق ختم نبوت پر تمام مسلمانوں کا ایمان ہے)اس کا دعویٰ ہے کہ اس پر دس ہزار سے زائد آیتیں اُتاری گئی ہیں اور اس کی تکذیب کرنے والا کافر ہے، نیز یہ کہ قادیان کا حج تمام مسلمانوں پر واجب ہے؛ کیوں کہ قادیان مکہ اور مدینہ کی طرح مقدس ہے اور قرآن کریم میں اس کا نام مسجد اقصیٰ بتایا گیا ہے، یہ تمام باتیں اس کی مطبوعہ کتب ''براہین احمدیہ'' اور ''تبلیغ'' نامی رسالہ میں صراحت کے ساتھ موجود ہیں۔

اکیڈمی کے اجلاس نے مرزا غلام احمد قادیانی کے بیٹے اور خلیفہ مرزا بشیر الدین کے اقوال وتصریحات کا بھی جائزہ لیا، اس کی کتاب ''آئینہ صداقت'' میں اس کا قول موجود ہے کہ :

جو مسلمان بھی مسیح موعود (یعنی اس کے والد مرزا غلام احمد) کی بیعت میں داخل نہ ہو، خواہ اس نے ان کا نام سنا ہو یا نہ سنا ہو، وہ کافر اور اسلام سے خارج ہے۔(۱)

قادیانی اخبار ''الفضل'' میں خود اس نے اپنے والد مرزا غلام احمد قادیانی کا یہ قول نقل کیا ہے :

مسلمانوں سے ہمارا ہر چیز میں اختلاف ہے، اللہ، رسول، قرآن، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، ان میں سے ہر چیز میں ان کے ساتھ ہمارا جوہری اختلاف ہے۔(۲)

اسی اخبار کی تیسری جلد میں یہ عبارت بھی ہے: ''بے شک مرزا ہی نبی محمد ﷺ ہیں'' اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے قرآن کے ان الفاظ: ''وَمُبَشِّراً بِرَسُوْلٍ يَأْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗ اَحْمَدُ'' کا مصداق خود اپنی ذات کو قرار دیا ہے۔(۳)

اجلاس نے معتبر مسلمان علماء اور اہل قلم کی ان تحریروں کو بھی اپنے پیش نظر رکھا، جن میں فرقۂ قادیانی احمدی کے اسلام سے مکمل طور پر خارج ہونے کی وضاحت کی گئی ہے۔

اسی بنیاد پر پاکستان میں شمالی سرحد کی صوبائی اسمبلی نے ۱۹۷۴ء میں اپنے تمام ممبران کی متفقہ آراء سے یہ فیصلہ کیا کہ باشندگانِ پاکستان میں قادیانی فرقہ ایک غیر مسلم اقلیت ہے۔

اس عقیدہ کے علاوہ مرزا غلام احمد قادیانی نے ہندوستان کی انگریزی حکومت جس کی تائید وحمایت اسے حاصل رہی ہے، کے نام اپنے خطوط میں حرمت جہاد کا اعلان بھی کیا، اس نے جہاد کے تصور کی نفی کی؛ تاکہ مسلمان ہندوستان کی استعماری انگریزی حکومت کے وفادار بن جائیں؛ کیوں کہ کچھ جاہل مسلمانوں کی طرف سے نظریۂ جہاد کی اشاعت مسلمانوں کی طرف سے انگریزوں کی وفاداری میں مانع بنتی ہے۔

---

(۱) آئینہ صداقت: ۲۵۔

(۲) اخبار الفضل: ۳۰ر جولائی ۱۹۳۱ء۔

(۳) سرالخلافۃ: ۲۱۔

وہ اپنی کتاب ''شہادۃ القرآن''، طبع ششم کے ضمیمہ میں صفحہ ۱۷ پر لکھتا ہے :

مجھے یقین ہے کہ میرے متبعین جتنے زیادہ ہوں گے اور ان کی تعداد جس قدر بڑھے گی، جہاد پر ایمان رکھنے والے کم ہوتے جائیں گے؛ کیوں کہ میرے مسیح یا مہدی ہونے پر ایمان لانے سے جہاد کا انکار لازم آتا ہے۔(۱)

اکیڈمی کا یہ اجلاس قادیانیت کے عقیدہ، آغاز، اس کی بنیادیں اور اسلام کے صحیح عقیدہ کی بیخ کنی اور مسلمانوں کو اپنے عقیدہ سے گمراہ کرنے والے ان کے خطرناک مقاصد سے متعلق ان تمام ثبوت و دلائل اور ان کے علاوہ دیگر بہت سارے تفصیلی ثبوتوں کی بنیاد پر بالاتفاق یہ فیصلہ کرتا ہے کہ :

قادیانیت (جسے احمدیت بھی کہتے ہیں) کا عقیدہ اسلام سے مکمل طور پر الگ ہے اور اس کے ماننے والے کافر اور اسلام سے مرتد ہیں اور ان کا اپنے کو مسلمان ظاہر کرنا سراسر دھوکہ ہے۔(۲)

اکیڈمی کا یہ اجلاس اعلان کرتا ہے کہ مسلم حکومتوں، علماء، اہل قلم، مفکرین اور دعاۃ وغیرہ کا یہ فریضہ ہے کہ وہ دنیا کے ہر گوشہ میں اس گمراہ فرقہ کا مقابلہ کریں، وباللہ التوفیق۔

• • •

(۱) دیکھئے: مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کا رسالہ، شائع کردہ رابطہ عالم اسلامی: ۲۵۔

(۲) فقہی فیصلے: ۴۹-۵۱۔

استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ

خالد سیف اللہ رحمانی

بلندیاں اُتر آتی ہیں جس کے آنگن میں
زمیں پہ رہتا تھا ، وہ شخص آسماں کی طرح

برصغیر کے مسلمانوں پر دینی اور علمی نقطہ نظر سے جس خانوادہ کا سب سے بڑا احسان ہے، وہ ہے حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا خاندان، جب ہندوستانی مسلمانوں کا سفینہ بھنور میں تھا، ان کا قصر اقتدار زمیں بوس ہورہا تھا اور اس بات کا اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ اس لٹی پٹی قوم کو کہیں متاعِ دین وایمان سے بھی محروم نہ کردیا جائے تو حضرت نانوتویؒ کی شکل میں ایک مردِ غیب نمودار ہوا، جس نے دیوبند کے چھوٹے سے قصبہ میں دارالعلوم کی بنیاد رکھی اور صرف ایک مدرسہ ہی قائم نہیں کیا؛ بلکہ قیام مدارس کی عظیم الشان تحریک برپا کی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس تحریک کے نقوش پورے برصغیر پر ثبت ہوگئے۔

اس خانوادہ کی خصوصیت حفاظتِ دین، دفاعِ اسلام پر خصوصی توجہ، فکر ونظر اور زبان وقلم میں اعتدال نیز اخلاق نبوی پر استقامت رہی ہے، حضرت نانوتویؒ اور ان کے صاحبزادے حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ (مہتمم دارالعلوم دیوبند ومفتی اعظم ریاست دکن) کے بارے میں تو سننے اور پڑھنے کا موقع ملا؛ لیکن اس خاندان کی تین بزرگ شخصیتوں کو سر کی آنکھوں سے دیکھنے، قدموں میں بیٹھنے اور قریب سے سمجھنے کی سعادت حاصل ہوئی، ان میں سب سے بلند پایہ شخصیت حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی تھی؛ جو ظاہر وباطن اور قول وفعل دونوں جہتوں سے ایسی شخصیت کے مالک تھے کہ جن کی طرف دل کھنچتا تھا اور نگاہِ شوق واحترام کو کشش ہوتی تھی؛ پھر آپ کے صاحبزادوں میں دو شخصیتوں کو امتیازی حیثیت حاصل ہوئی، ایک: استاذ گرامی حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ، دوسرے: حضرت مولانا محمد اسلم قاسمیؒ، ثانی الذکر عمر میں چھوٹے تھے؛ مگر انہوں نے منزل آخرت کی طرف پہلے رخت سفر باندھ لیا تھا، ابھی یہ زخم تازہ تھا کہ حضرت قاری صاحبؒ کے علمی وفکری جانشین اور خطیبانہ مہارت کے عکس جمیل استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی دار بقاء کی طرف کوچ فرمایا۔

سرخی مائل کھلا ہوا رنگ، کشادہ پیشانی، فراخ چشم، کسی قدر مستطیل چہرہ، بھرے ہوئے رخسار، سفید اور ایک حد تک گھنی داڑھی، اوسط سے کچھ نکلتا ہوا قد، نہ بہت دبلے نہ بہت لحیم وشحیم، زیادہ تر نگاہیں جھکی ہوئیں، ایک ایک ادا وقار واعتبار کا مظہر، بے موقع گفتگو سے حد درجہ اجتناب، ذوقِ نفاست ایک ایک چیز سے آشکار، ٹوپی والد ماجد کی طرح دوپلی اور قدرے اونچی، جو شیروانی کی ہم رنگ اور شیروانی زیب تن نہ ہو تو کرتے کے ہم رنگ ہوتی، سفید کرتا، سفید پائجامہ، ہاتھ میں خوبصورت سا عصاء پیری، غرض ہر چیز سے سلیقہ اور خوش ذوقی عیاں، شروع سے ہی چہرے پر نور کی برسات نظر آتی؛ لیکن آخر عمر میں تو پوری طرح والد ماجد کے مثنی بن گئے تھے، یہ ہے حضرت الاستاذ کے سراپا کی ایک جھلک!

۲۲؍جمادی الثانیہ ۱۳۶۷ھ مطابق ۸؍جنوری ۱۹۲۶ء کو دیوبند میں پیدا ہوئے، عربی تعلیم کا آغاز حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ہاتھوں ہوا، جن سے آپ نے میزان الصرف پڑھی، بقیہ ابتداء سے انتہاء تک پوری تعلیم دارالعلوم دیوبند ہی میں ہوئی، ۱۳۶۴ھ مطابق ۱۹۴۸ء میں فراغت ہوئی، اپنے والد ماجد کے علاوہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا اعزاز علی امروہویؒ، حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، حضرت مولانا بشیر احمد خان بلند شہریؒ، حضرت مولانا عبدالسمیع دیوبندیؒ اور حضرت مولانا فخر الحسن مرادآبادیؒ وغیرہ جیسے مایہ ناز اساتذہ سے کسب فیض کیا، اور جہاں تک میں نے محسوس کیا، اپنے اساتذہ میں غالباً آپ علامہ ابراہیم بلیاویؒ سے سب سے زیادہ متاثر تھے۔

تعلیمی مرحلہ مکمل ہونے کے ساتھ ہی دارالعلوم میں بحیثیت مدرس تقرر ہوگیا، تدریسی سفر نور الایضاح اور ترجمہ قرآن مجید سے شروع ہوا اور بخاری شریف نیز صحاح ستہ کی دوسری کتب تک پہنچا، اس حقیر کو آپ سے سنن ابن ماجہ پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، آپ واقعی بلند پایہ مدرس تھے، موضوع کے مالہ وماعلیہ پر تفصیل سے گفتگو کرتے، وقت کی پابندی کا غیر معمولی اہتمام ہوتا، ادھر گھنٹی شروع ہوئی اور ادھر درسگاہ میں موجود، کیا مجال کہ پانچ منٹ کی بھی تاخیر ہوجائے اور ٹھیک وقت پر درس ختم ہوجاتا، دوران درس غیر متعلق گفتگو اور ہنسی مذاق کا مزاج بالکل نہیں تھا؛ اس لئے درس گاہ پر سنجیدگی کی فضا چھائی رہتی اور طلبا بھی پوری یکسوئی کے ساتھ متوجہ رہتے، تقریر میں ''ظاہر ہے'' اور ''غیر معمولی'' کے الفاظ بار بار استعمال کرتے؛ گویا ایک طرح سے ان الفاظ کو تکیہ کلام کا درجہ حاصل تھا۔

یوں تو مولانا کے تمام ہی اسباق شوق کے کانوں سنے جاتے تھے؛ لیکن ہم لوگوں کے زمانہ میں خاص کر شرح عقائد اور ابن ماجہ کا درس معروف اور طلبا کے درمیان مقبول تھا، اور کیوں نہ ہوتا کہ علم کلام خانوادہ قاسمی کا خاص موضوع رہا ہے؛ چنانچہ حضرت والا صفات باری، مسئلہ تقدیر، اشاعرہ، ماتریدیہ، محدثین اور اسلام کی طرف منسوب

دیگر فرقوں کے اعتقادات پر بڑی بصیرت مندانہ گفتگو فرماتے تھے، اور یوں بھی آپ کی گفتگو میں علم کلام کی اصطلاحات خاص طور پر شامل رہتی تھیں، ابن ماجہ کے درس میں ایک دو دن مسلک دیوبند پر تفصیل سے گفتگو فرماتے، اور دیوبند کی علمی جامعیت اور مسلکی اعتدال پر بھرپور مواد کے ساتھ خوبصورت تعبیر میں روشنی ڈالتے، آپ کے تلامذہ میں بھی بڑے باکمال علماء پیدا ہوئے، جن میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ، مفتی سعید احمد پالن پوری، مولانا اسرار الحق قاسمی، مولانا عبد الخالق سنبھلی، مولانا بدر الدین اجمل، مولانا بدر الحسن قاسمی اور مولانا مجیب اللہ گونڈوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس حقیر نے پہلی بار اس وقت آپ کا دیدار کیا، جب اس کی عمر آٹھ نو سال رہی ہوگی، میرے آبائی گاؤں جالے، ضلع دربھنگہ (بہار) سے قریب ہی دوگھرا نامی مسلمانوں کی ایک بستی واقع ہے، جہاں مدرسہ قاسم العلوم حسینیہ کے نام سے ایک دینی درسگاہ قائم ہے؛ اس مدرسہ میں، میں نے بھی ایک دو سال تعلیم حاصل کی ہے، یہیں سیرت کے موضوع پر ایک بڑا اعوامی جلسہ منعقد ہوا، جس میں دور دور سے علاقہ کے لوگ شریک ہوئے، اس وقت اتنا شعور نہیں تھا کہ مولانا کے خطاب کو ہضم کر پاتا اور اس کے علمی مضامین سے لطف اندوز ہوتا؛ لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ تمام بزرگوں کی زبان پر تحسین وآفرین کے کلمات تھے، میرے والد ماجد مرحوم خود ایک وسیع المطالعہ عالم اور طبیب تھے، اور علمی موضوعات پر نقد وجرح کا ذوق رکھتے تھے، ان کو بھی مولانا کی تقریر کا بڑا امداح پایا؛ اس وقت مولانا کی داڑھی سفید ہو چکی تھی؛ البتہ مولانا ایک عرصہ تک سیاہ خضاب کے معاملہ میں ان فقہاء کی رائے پر عامل تھے، جن کے نزدیک اس کی گنجائش ہے، اور نہایت چاق وچوبند تھے؛ اس لئے عمر کا اندازہ نہ ہوتا تھا۔

خطابت کا اعلی ذوق اور بلند معیار آپ کو اپنے والد ماجد سے وراثت میں ملا تھا؛ جس موضوع پر خطاب فرماتے، اس کی گہرائی تک جاتے، پورا خطاب اس طرح مرتب اور مربوط ہوتا کہ گویا ایک ہار ہے؛ جس کی کڑیوں کو ایک دوسرے سے منسلک کر دیا گیا ہے؛ اگر ایک کڑی ٹوٹ جائے تو اگلی کڑیاں بکھر کر رہ جائیں، زبان میں غیر معمولی سلاست اور روانی تھی، تقریر میں ایسا تسلسل ہوتا کہ گویا دریا کی ایک لہر ہے جو سبک خرامی سے آگے بڑھتی جارہی ہے، دار العلوم کی طالب علمی کے دوران آپ کے دو ایسے یادگار خطابات سنے؛ جن کی لذت سے آج تک گوش دل شاد کام ہے، ایک اس وقت کا خطاب جب سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر فخر الدین علی احمد مرحوم دار العلوم تشریف لائے، احاطہ دار العلوم کے کھلے سبزہ زار پر ان کے اعزاز میں جلسہ ہوا، قاری عبد اللہ سلیم صاحب نے قرآن مجید کی ایسی تلاوت کی کہ سماں بندھ گیا، بحیثیت میزبان حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے سپاس نامہ پیش فرمایا، اور حضرت الاستاذ مولانا محمد سالم قاسمی صاحبؒ نے استقبالیہ کلمات کہتے ہوئے دار العلوم کا

تعارف کرایا، اخیر میں ڈاکٹر فخر الدین علی احمد مرحوم نے بحیثیت مہمان خطاب کیا اور دار العلوم کو خراج عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ دار العلوم کے مہتمم عالی وقار حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے تئیں گہرے جذبات احترام کا اظہار بھی کیا، جب مہتمم صاحب سپاس نامہ پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے تو انھوں نے اصرار کیا کہ آپ بیٹھ کر پڑھنے پر اکتفا کریں، بہر حال اس پروگرام کا حاصل استاذ محترم کا تعارفی خطاب تھا؛ جس میں دینی تعلیم اور مدارس اسلامیہ کی پوری تاریخ دریا بکوزہ ہوکر سمٹ گئی تھی، پھر آپ نے دار العلوم کے فکری شجرۂ نسب، فکر ولی اللہی کی اہمیت اور دار العلوم کے نصاب میں منقولات ومعقولات کی جامعیت پر بڑی عمدہ روشنی ڈالی، جہاں تک مجھے یاد ہے آپ کا یہ خطاب زبانی تھا، خطاب کیا تھا، ہر ہر جملہ بلکہ ہر ہر لفظ نپا تلا، خوبصورت اور معنویت سے بھرپور، اس رواں، سلیس، اور اثر انگیز خطاب نے صدر جمہوریہ کو بھی متاثر کیا اور دیگر حاضرین کو بھی، جس میں دار العلوم کی فکر، اس کے قیام کا پس منظر، اس کا نظام تعلیم، اس کی علمی جامعیت، جنگ آزادی میں اس کا حصہ اور اس کے مسلکِ اعتدال کا عطر آ گیا تھا۔

دوسرا خطاب ''غلہ اسکیم جلسہ'' کا تھا، جو ہر دوسرے سال اجناس کی وصولی کے لئے ہوا کرتا تھا اور اس میں پورا مغربی یوپی اُمڈ آتا تھا، ہمیشہ مہتمم دار العلوم اس اجلاس کی صدارت فرمایا کرتے تھے، اور کلیدی خطاب بھی ان ہی کا ہوا کرتا تھا، اس بار حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ بیرون ملک کے سفر پر تھے؛ اس لئے دار العلوم کے صدر مدرس استاذ گرامی حضرت مولانا فخر الحسن صاحبؒ صدارت فرما رہے تھے، دار العلوم کے مختلف اساتذہ کے خطابات ہوئے، دار العلوم کے باہر سے غالباً صرف حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ کی تقریر ہوئی، حضرت مولانا فخر الحسن صاحبؒ اگرچہ غیر معمولی طلاقت لسانی کے مالک تھے اور جب بولتے تھے خوب بولتے تھے؛ لیکن پیرانہ سالی، ضعف ونقاہت اور بیماری کی وجہ سے انھوں نے پروگرام کے اخیر میں مختصر تمہیدی گفتگو کرتے ہوئے آپؒ کو دعوت خطاب دیا، آپ نے ڈیڑھ دو گھنٹے بہت ہی مفصل اور فکر انگیز خطاب فرمایا، جس کا موضوع تھا ''علم ظاہری اور معرفت باطنی''، آپ نے ''علّم آدم الأسماء کلّھا'' کے ارشاد خداوندی سے اپنے خطاب کا آغاز فرمایا، نیز علم اور معرفت دونوں کی اہمیت اور اس سلسلہ میں آیات واحادیث کو پیش کرتے ہوئے آخر میں دار العلوم دیوبند کے مزاج ومذاق کی تشریح کی کہ اس کی بنیاد ان دونوں پہلوؤں کی جامعیت پر ہے، آپ کو دار العلوم سے ایسا تعلق تھا کہ گویا وہ آپ کی سانسوں کا حصہ ہے؛ اس لئے کوئی خطاب یا کوئی مجلس ایسی نہیں ہوتی، جو دار العلوم اور اکابر دار العلوم کے ذکرِ خیر سے خالی رہ جائے، اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ وہ اپنے عہد میں فکر دیوبند کے سب سے بڑے ترجمان تھے اور کیوں نہ ہوتے کہ آپ کا بانی دار العلوم سے صرف فکری اور علمی ہی تعلق نہیں تھا؛ بلکہ نسبی تعلق بھی تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ اعلیٰ درجہ کے خطیب تھے، یہاں تک کہ علماء اور عوام کے درمیان آپ کا لقب ہی خطیب الاسلام ہوگیا؛ لیکن آپ کے خطاب میں جوش اور بہت سے خطیبوں کی طرح شور و ہنگامہ اور رونا گانا، نشیب وفراز اور آواز کا اُتار چڑھاؤ نہیں تھا؛ بلکہ گفتگو میں تسلسل ہوتا اور آواز کی ایک ہی سطح پر بات ہوتی تھی، جس میں دریا کی تہہ میں بہنے والی کم آواز لہروں کی روانی کا احساس ہوتا تھا، اسی طرح پُر تصنع الفاظ کا انبار لگانے کا مظاہرہ بھی نہیں تھا؛ بلکہ آپ کا خطاب معنویت اور علمی نکتہ سنجیوں سے معمور ہوتا تھا، اور آپ بیک وقت دل ودماغ دونوں کو اپنا مخاطب بنا سکتے تھے، آپ کے مطبوعہ خطبات موجود ہیں، جن میں علم وفن کے کتنے ہی دُرآب دار قدم قدم پر ملتے ہیں، جو خصوصیت حضرت تھانویؒ کے مواعظ اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے خطبات میں پائی جاتی ہے، وہی عکس حضرت الاستاذ کے خطبات میں بھی پائے جاتے ہیں۔

مولانا کے خطبات کی طرح آپ کی مجلسیں بھی بڑی مفید اور اہل علم کے لئے دیدۂ دل ودماغ کو روشن کرنے والی ہوتی تھیں، یہ حقیر حضرت حکیم الاسلام کی مجلسوں میں شریک ہوا کرتا تھا، اسے حضرت الاستاذ کی مجلس میں شرکت کا موقع نہیں ملا؛ لیکن بعض خوش نصیبوں نے —— جن میں مولانا محمد یامین قاسمی صاحب خصوصیت سے قابل ذکر ہیں —— نے ان مجالس کو مرتب کر کے طبع فرمایا، ان مجلسوں میں بہت ہی مفید علمی نکات، حکیمانہ تجزیے، بزرگوں کے پُرتاثیر تذکرے اور ادبی رعنائی نیز خوش مزاجی کے شواہد ملتے ہیں، اور علماء وطالبان علوم نبوت کے لئے خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں۔

اگرچہ آپ کا شہرہ خطابت وتقریر میں تھا اور آپ نے اسفار کی کثرت کی وجہ سے تصنیف وتالیف کی طرف کم توجہ دی؛ لیکن آپ نے جو کچھ لکھا، خوب لکھا، آپ کی تالیفات میں ''قرآن کریم کے اردو تراجم کا جائزہ'' ایک اہم کتاب ہے، جس میں قرآن کریم کے بیشتر تراجم کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے نمونے بھی پیش کئے گئے ہیں، سیرت نبوی ﷺ پر ایک جامع رسالہ بھی آپ کے قلم سے ہے، اس کے علاوہ ''تاجدار ارض حرم، سفرنامۂ برما، ایک عظیم تاریخی خدمت، حقیقت معراج'' اور ''مردان غازی'' آپ کی تصانیف ہیں، آپ کا یہ رسالہ ''مردان غازی'' آپ کے ادبی ذوق اور قلمی رعنائی کی جیتی جاگتی مثال ہے، اور اسے افسانوی اسلوب میں لکھا گیا ہے، کتاب کا یہ اقتباس قابل ملاحظہ ہے :

> ہر سپاہی سرتا پا لوہے میں غرق ہے، موٹی موٹی زنجیروں سے بنی ہوئی زرہیں زیب تن ہیں اور اونچی اونچی کلغی دار خودیں سروں پر جگمگا رہی ہیں، ترکشوں میں بے شمار تیر ہیں، میانوں میں تلواریں ہیں، پرتلوں میں آتشیں نیزے ہیں، صبا رفتار جنگی گھوڑے

ہیں، ان کے بالمقابل چندافراد پر مشتمل پاکباز جماعت ہے، وہ بھی رسمی فوجی لوازم سے بے نیاز۔ (سیرت وشخصیت خطیب الاسلام: ۲/۱۵۱)

عربی زبان میں آپ کی گراں قدر تالیف ''مبادی التربیة الاسلامیه'' ہے، اس کے علاوہ بھی مختلف فکری وعلمی رسائل اور بے شمار مضامین ہیں، جن کو یکجا کتابی شکل میں شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

حضرت الاستاذ کے قلم میں عام طور پر حضرت نانوتوی کے اُسلوب کا عکس پیا جاتا ہے، کسی بات کو پیش کرنے اور کسی دعویٰ کو مدلل کرنے کے لئے پہلے اُصول کو ذکر کرتے ہیں اور پھر اس پر اپنے مدعا کو منطبق کرتے ہیں، حضرت نانوتوی کا اصل میدان علم کلام ہے، اور علم کلام پر جب بھی کوئی شخص قلم اُٹھائے، ضروری ہے کہ اس کے قلم کو فنی اصطلاحات کا بوجھ بھی اُٹھانا پڑے؛ کیوں کہ اصطلاحات کا ترجمہ کرنا مشکل بھی ہوتا ہے اور اس میں کئی کئی سطروں کو ایک دولفظوں میں بیان کر دیا جاتا ہے؛ اس لئے مولانا کی تحریر وتقریر بعض دفعہ اصلاحی تعبیرات کی وجہ سے بوجھل معلوم ہوتا ہے؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ رواں اور سلیس نثر کے ڈھیر سارے نمونے بھی آپ کے یہاں موجود ہیں۔

اس ادبی ذوق کی انتہا یہ ہے کہ آپ شعروسخن کے میدان میں بھی طبع آزمائی فرمایا کرتے تھے، اور ''ندیم'' آپ کا تخلص تھا، آپ کے اشعار ادبی شہ پاروں کی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں اردو کے مختلف استاذ شعراء کا رنگ پایا جاتا ہے، کہیں میر کی سادہ زبان اور چھوٹے چھوٹے دل کو چھو لینے والے مصرعے، جیسے اپنے والدین ماجدین کے حج سے واپسی پر آپ نے جو نظم کہی ہے، اس کے چند اشعار اس طرح ہیں :

پھر گھٹا رحمتوں کی چھائی ہے — پھر تمنائے دل برآئی ہے
کعبۂ دل میں رب کعبہ کے — عشق کی شمع نو جلائی ہے
اپنا مقصود اب ندیم فقط — درِ کعبہ کی جبہ سائی ہے

کہیں جوش اور اقبال کا ولولہ اور انقلابی رنگ پایا جاتا ہے، جیسے اپنی چھوٹی بہن حمیرہ کے پاکستان منتقل ہونے کے موقع پر فرماتے ہیں :

اے شریک شیر ما در ! اے محبت کی شعاع
آج اِن لرزاں لبوں پر آ گیا لفظ وِداع
الوداع اے مخزنِ اخلاص و اُلفت ! الوداع
الوداع اے گلشنِ طیب کی نکہت ! الوداع

بہر حال مولانا کی زندگی اسلام کی حفاظت واشاعت کے لئے وقف تھی؛ اس لئے شعروسخن کی دنیا میں بھی

ان کا سفر اسی سمت مین ہوتا تھا، اور اشعار میں بھی امت کو حیات بخش پیغام دینے کی کوشش ہوتی تھی، ہندوستان میں جو خونریز فسادات ہوئے اور مسلمانوں کی جان ومال اور عزت وآبرو کی جو پامالی ہوئی، اس پس منظر میں آپ نے ایک نظم کہی ہے، جس میں مایوسی اور دل شکستہ کئے بغیر بڑی خوبصورتی کے ساتھ جرأت وہمت اور اولوالعزمی کا پیغام دیا گیا ہے :

بحمد اللہ حق کا بول بالا ہونے والا ہے
سیاہی چھٹ رہی ہے ، اب اُجالا ہونے والا ہے
شہیدوں کا لہو پیتے ہی ذرے ، بول اُٹھتے ہیں
یہ خطہ آج کل میں کِشت لالہ ہونے والا ہے
جو حق پر جم کے اس پر جان تک قربان کرتے ہوں
تو دنیا میں مقام ان کا ہی اعلیٰ ہونے والا ہے
مرا قرآن کہتا ہے میرا ایمان کہتا ہے
ظہورِ نصرتِ باری تعالیٰ ہونے والا ہے

آپ نے اپنے والد ماجد حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ پر ان کی وفات کے بعد جو نظم کہی ہے، وہ بھی کیفیت وتاثیر میں ڈوبی ہوئی ہے، یہ نظم ان اشعار پر ختم ہوتی ہے :

تھی رفیق زندگی، توفیق حق گوئی تیری
تجھ پر قرباں تا کہ ہوں دنیا کے تن من اور دھن
رحمتِ رب سے رہے روشن سدا تُربت تری
یہ دُعاء دیتا ہے تجھ کو سالم مخلص کا من

اپنی شریک حیات امتہ الاکرام شریفہ مرحومہ ۳؍محرم ۱۴۳۱ھ کی وفات پر آپ نے ایک طویل نظم کہی ہے، یہ ایسی نظم ہے کہ پڑھ کر آنکھ نم ہوجاتی ہے، اس کے ابتدائی چند اشعار اس طرح ہیں :

نہیں معلوم تھا فرقت میں دل پہ کیا گزرتی ہے
تمنا دل میں آنے سے جھجکتی ہے لرزتی ہے
نہیں تھی آشنائی میری اِن آنکھوں کو اشکوں سے
ان آنکھوں کو اگر اب چین ملتی ہے تو اشکوں سے

میرے اشکوں کے سچے موتیوں کا یہ نیا جھومر
سجے گا خوب یہ سجدوں کے عادی تیرے ماتھے پر

یوں تو اللہ تعالی نے آپ کو بہت سے اعلی اوصاف سے نوازا تھا؛لیکن آپ کے اندر تین ایسے بنیادی اوصاف تھے؛ جو عام طور پر موجودہ دور میں بہت کمیاب ہیں: فکری اعتدال، زبان کی حفاظت، اور اتحاد امت کی غیر معمولی تڑپ ـــ آپ کے ہر خطاب اور ہر تحریر میں فکری اعتدال کا رنگ جھلکتا تھا؛ اسی لئے جن اداروں میں مسلمانوں کے مختلف مسالک اور مکاتب فکر کی نمائندگی ہوا کرتی تھی، ان میں یکساں طور پر تمام طبقات آپ کی قیادت کو تسلیم کرتے تھے، آپ ابتداء قیام ہی سے نہ صرف آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن تاسیسی تھے؛ بلکہ آپ کا شمار اہم ترین ارکان میں تھا، اور آپ مسلم پرسنل لا کنونشن ممبئی کے داعیوں میں تھے، جو بورڈ کی تاسیس کا سبب بنا، پھر بعد میں آپ بورڈ کے نائب صدر منتخب ہوئے، ممبئی کنونشن میں آپ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا :

> جس مسئلے نے دن کا چین اور رات کی نیند حرام کر دی ہے، وہ مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کا مسئلہ ہے، یہ مسئلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے، ہم بڑے اضطراب سے دوچار ہیں، اور اس میں ایک خیر کا پہلو بھی ہے، وہ یہ کہ ہماری اضطراب کے ذریعہ آزمائش ہو رہی ہے، آیا ہم اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں یا پیٹھ پھیر دیتے ہیں؟ اور یہ بات مسلّم ہے کہ دین خداوندی کو باقی رکھنے کے لئے اللہ کو تمہاری حاجت نہیں؛ بلکہ تمہیں حاجت دین خداوندی کی ہے؛ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: ''وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ''(محمد:۳۸) اگر تم نے دین کی حفاظت سے رُخ پھیر لیا تو اللہ تعالیٰ ایسی قوم لا کھڑا کرے گا، جو تمہارے جیسی نہ ہوگی، اور وہ دین کی حفاظت کرے گی، تمہارا ایمان لانا کوئی خدا پر احسان نہیں ہے؛ بلکہ اُس کا احسان ہے کہ اس نے اپنی ہدایت سے نوازا: ''قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ '' (حجرات: ۱۷) اے نبی! کہہ دو کہ تم اپنے ایمان کا احسان نہ جتاؤ؛ بلکہ خدا کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تم کو ہدایت سے نوازا۔

مجلس مشاورت کے بھی آپ صدر منتخب ہوئے اور اخیر تک اس کے سرپرست رہے، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے آپ کی سرپرستی کو باعث اعزاز سمجھا اور آپ کی رہنمائی سے فائدہ اٹھایا، آپ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کورٹ کے ممبر بھی رہے، ندوۃ العلماء اور مظاہر علوم وقف کی شوریٰ کے بھی رکن تھے، آپ نے اکیڈمی کے ایک سمینار میں افتتاحی خطبہ پیش کرتے ہوئے بہت اہم بات فرمائی کہ ''مسلک قابل ترجیح تو ہے قابل تبلیغ نہیں ہے''، یہ بڑے پایہ کی بات ہے،

جس سے آج بڑے بڑے اہل علم غافل ہیں اوراس پر توجہ نہ دینے کی وجہ سے مسلکی تشدد، افراط وتفریط اور فکری بے اعتدالی پیدا ہوتی ہے، اس معاملہ میں مولانا کے یہاں قول وفعل کے درمیان مکمل ہم آہنگی پائی جاتی تھی، آپ نے اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے سترہویں فقہی سمینار منعقدہ برہان پور (ایم پی) بتاریخ ۲۸-۳۰ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ، مطابق ۵-۷ اپریل ۲۰۰۸ء میں جو خطبہ دیا تھا، اس کا یہ چشم کشا اقتباس قابل ملاحظہ ہے :

> حضرات ! ظاہر ہے کہ فقہ کی یہ کتابیں اجتہاد اور استنباط کے نتیجہ میں سامنے آئیں اور جب تک ہر ہر جزئیہ پر دلائل نقلیہ اور دلائل عقلیہ یقینیہ مکمل طور پر قائم نہیں کئے گئے، اس وقت تک حضرات مجتہدین نے ان کو بطور مذہب قبول نہیں کیا، یہ حضرات اگرچہ دیانت کے مقامِ عظمت پر فائز ہیں؛ لیکن اس کے باوجود استدلال اور استنباط کا تعلق چونکہ عقل انسانی سے ہے، اور عقل انسانی میں صواب کے ساتھ خطا کا امکان ضرور ہے، اسی بنا پر اِن حضرات فقہاء کے یہاں استدلالی اور استنباطی اختلاف بھی پیدا ہوا، تو گویا عقل انسانی جہاں کارفرما ہوتی ہے، اس کے اندر امکانِ اختلاف ناگزیر بن جاتا ہے؛ لیکن ''اختلاف أمتی رحمة واسعة'' (میری امت کا اختلاف بھی رحمت واسعہ ہے) کے تحت اس اختلاف کے نتیجہ میں علم عظیم کے دروازے آپ کے سامنے کھلے، آج وہ ہم سب کے لئے کارآمد بن رہا ہے، آپ کسی بھی فقہ کو اختیار کریں، حنفی ہوں، شافعی ہوں، مالکی ہوں یا حنبلی؛ لیکن ظاہر ہے مستفید آپ سب سے ہورہے ہیں، یہ سارے فقہاء آپ کے لئے قابل عظمت ہیں، ان چار فقہاء کو تلقی بالقبول امت میں عطا فرمائی گئی ہے۔

لیکن اس سلسلہ میں ایک بنیادی فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ فقہاء کا مستنبط کردہ قانونِ اسلامی دین کے درجہ میں نہیں ہے، دین وہ ہے جو منزّل من اللہ ہے، جس میں عقل انسانی قطعاً دخیل نہیں ہے، ظاہر ہے کہ جس کے اندر عقل انسانی دخیل ہو تو وہ قابل تبلیغ نہیں ہوسکتا، قابل تبلیغ صرف دین منزّل من اللہ ہی ہوگا، بخلاف مذاہب فقہاء کے، کہ وہ اجتہادی اور استنباطی ہیں؛ اس لئے ان کا درجہ ترجیحی تو ہوسکتا ہے، تبلیغی نہیں ہوسکتا، اگر ان کو درجۂ تبلیغ دے دیا جائے تو یہ دین منزّل کے ساتھ ناانصافی ہوگی؛ اس لئے کہ دین میں کسی اختلاف، کسی تضاد کا امکان نہیں ہوتا؛ بخلاف مذہب کے کہ اس میں استنباط واستدلال عقلی کی وجہ سے اختلاف کا پیدا ہونا ناگزیر ہے؛ لہٰذا یہ فرق مراتب قائم رکھنا ضروری ہے کہ دین کو مقام تبلیغ پر رکھئے اور مذہب فقہی کو ترجیح کے درجے پر رکھئے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ مذہب قابل تبلیغ نہیں ہوتا ،صرف قابل ترجیح ہوتا ہے،تو ضرورت جب پیش آئے تو دلائل کی قوت کی بنا پر آپ کسی بھی مذہب فقہی کو اختیار کر سکتے ہیں ؛لیکن ان فقہی مذاہب کی دعوت دینے کا آپ کو حق نہیں دیا جائے گا ، کیونکہ دعوت دیئے جانے کا حق دار صرف دین ہے، انبیاء کرام،صحابہ کرام،علماء کرام یہ سب دین ہی کی دعوت دیتے رہے ہیں، جب دوسری قومیں اسلام میں داخل ہوئیں تو مذاہب سابقہ کے جو اصول وکلیات ان کے ذہنوں کے اندر تھے، ان سے قانونی سوالات ،شبہات اور اعتراضات سامنے آئے اور وہ ان کے جوابات چاہتے تھے،اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اللہ تعالی نے فقہاء کرام کو پیدا فرمایا اور وہ علم عظیم ان کو عطا فرمایا کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے انھوں نے مدلل مسائل نکال کر ان کے جوابات سے مطمئن فرمایا، جب تک ایک ایک مسئلہ پر متعدد حجتیں قائم نہیں ہو گئیں ،ان پر وہ قطعی طور پر مطمئن نہیں ہو گئے اور اس وقت تک اس کو اپنا مذہب قرار نہیں دیا، ان فقہاء کرام کے درمیان اگر استدلالی اختلاف ہوا بھی تو وہ انتہائی دیانت پر مبنی تھا،جس پر نا قابل انکار شہادت ''نحن على الصواب مع احتمال الخطأ والغير على الخطأ مع احتمال الصواب'' ہے، ہمارا صواب امکان خطا سے خالی نہیں، اور دوسرے ہمارے نزدیک خاطی ہیں ؛لیکن ان کی طرف بھی صواب کا امکان موجود ہے،اس سے بڑا دیانت کا ثبوت کوئی نہیں ہوسکتا۔

دور عباسی میں مختلف مذاہب فقہیہ کے مرتب ومدون ہونے کے بعد لوگوں نے حنفی ، مالکی ،شافعی حنبلی فقہوں کو قبول کیا ؛لیکن بعد کو یہ علمی انحطاط بھی پیدا ہو گیا کہ اہل علم نے اپنی فقہ کی علمی برتری کو ثابت کرنے کے لئے اس کو تبلیغی بنا کر پیش کرنا شروع کر دیا، نیجتاً دین اور مذہب میں جو فرق تبلیغی اور ترجیحی ہونے کا تھا ، وہ برقرار نہیں رہا ، جب کہ مذہبِ فقہی کا درجہ عقل انسانی کے دخیل ہونے کی وجہ سے دین سے کم ہے، اور اس فرق مراتب کو باقی رکھنا ضروری ہے ؛لیکن نئے نئے وقائع اور حوادث پیدا ہوتے رہتے ہیں، ہر دور کے نئے نئے حوادث میں الحمد للہ ہمارے مفتی حضرات، علماء کرام مسائلِ وقت کا صحیح حل نکالنے کے لئے پہلے دین اس کے بعد مذہب فقہی کو سامنے رکھتے ہیں، ان دونوں کی روشنی میں دیانت کے ساتھ وقت کے مسائل اور حوادث کا فیصلہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے۔

لیکن دور حاضر میں انحطاطِ علمی بعض افراد وطبقات میں یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ انھوں نے دین منزّل من اللہ اور خطاء وصواب کا احتمال رکھنے والے مجتہد فیہ فقہ سے ماخوذ ومستنبط مسالک کو تبلیغی بنا کر دین کے ہم پلہ بنا رکھا ہے، جب کہ مدار نجات اور مستحق تبلیغ فقط دین ہے، مذہب فقہی اور مسلک مختار نہ مدار نجات ہیں اور نہ مستحق تبلیغ ہیں ؛ لہٰذا آگے بڑھ کر اگر میں یہ عرض کروں تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ اس انحطاط کے نتیجہ میں ایک ذہنیت یہ پیدا ہوئی کہ لوگ

دین سے اتر کر مذہب پر آئے، مذہب سے اتر کر مسلک پر آئے اور آج انحطاطِ علمی یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ مشرب جو محض ذوقی چیز ہے، انھوں نے مسلک کا قائم مقام مشرب تک کو بنا رکھا ہے اور اس کی تبلیغ بھی شروع کردی ہے، بالفاظ دیگر مسلک سے بھی نیچے اتر کر انھوں نے اپنی ذوقی چیز کو دنیا کے سامنے بطور دین پیش کرنا شروع کردیا ہے، ان محرومِ علم طبقات کا صحیح الفکر علماء کو پوری قوت سے رد کرنا پڑ رہا ہے۔(دین اور فقہی مذاہب ومسالک،ص:۱۱)

حضرت والا کا یہ پورا خطبہ اس لائق ہے کہ علماء اس کو سرمہ چشم بنائیں، یہ موجودہ دور میں پائے جانے والے افراط وتفریط کے لئے اکسیر ہے، اس فکری اعتدال کا اظہار بعض مسائل شرعیہ میں بھی ہوتا رہتا تھا؛ جیسے ٹی وی چینل کے بارے میں آپ کی رائے جواز کی تھی اور آپ کا نقطہ نظر تھا کہ جس چیز کو باہر دیکھنا ناجائز ہے، ٹی وی میں دیکھنا بھی ناجائز ہے، اور جس چیز کو باہر دیکھنا جائز ہے، اس کو ٹی وی پر بھی دیکھنا جائز ہے، یعنی آپ ٹی وی اسکرین پر نظر آنے والی شکلوں کو عکس تصور کرتے تھے نہ کہ تصویر۔

مولانا احکام شرعیہ کی تشریح میں بھی افراط وتفریط سے بچنے اور اعتدال ومیانہ روی کا راستہ اختیار کرنے کی تلقین کرتے تھے؛ اس لئے چاہتے ہیں کہ تدین اور تمدن دونوں کو ساتھ لے کر چلا جائے؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

> جس طرح تدین کے برخلاف علی الاطلاق محاذ قائم کرنا الحاد وارتداد کی زد میں آتا ہے، اسی طرح تمدن کے برخلاف علی الاطلاق محاذ قائم کرنا اسلام کے بارے میں اس بدگمانی کی راہ ہموار کردیتا ہے کہ اسلام عصر حاضر کے ارتقاء پذیر اور غیر معمولی تیز رفتار تمدن کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔(خطبات خطیب الاسلام:۱/۱۸۹)

یہ بڑا اہم لفظ ہے، جہاں تمدن کے تقاضوں کا غلبہ ہوتا ہے، وہاں دین سے انحراف کا مزاج بنتا ہے، اور جہاں تدین میں غلو ہو جاتا ہے، وہاں دین کی ایسی تصویر پیش کی جاتی ہے، جو اپنے عہد کی ضرورتوں سے ہم آہنگ نہیں ہوتی، اور اس کی وجہ سے لوگ دین کو ازکار رفتہ چیز تصور کرنے لگتے ہیں، اور اس کا سبب وہ لوگ بنتے ہیں جو شریعت کو ایک بے لچک اور اپنے عہد کی ضرورتوں سے بے نیاز نظام حیات کے طور پر پیش کرتے ہیں؛ چنانچہ آپ نے تقویٰ اور فتویٰ کے موقع ومحل کو بڑی خوبصورتی سے واضح فرمایا ہے :

> راہ تقویٰ ارباب ہمت وعزیمت کے لئے ہے؛ لیکن فتویٰ کی وسعتیں اس دین فطرت، اسلام میں کم ہمت وبے عزیمت عوام کے لئے ہیں، ان کو عزیمت وہمت کی راہوں پر چلانے کی کوشش ان کے قلموں کو صراط مستقیم سے ڈگمگانے کا ذریعہ تو بن سکتی ہے؛ لیکن فقدان عزیمت کی وجہ سے راہ تقویٰ پر ان کی استقامت تو دور کی چیز ہے، ان کا اس پر آنا ہی متوقع نہیں ہوسکتا۔(خطبات خطیب الاسلام:۱/۱۹۰)

مولانا اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ آدمی کسی بھی مذہب فقہی کا مقلد ہو؛ لیکن اسے تمام ائمہ مجتہدین کو اپنا محسن اور اُن کا احترام کرنا چاہئے؛ کیوں کہ ائمہ کا احترام ان کے علم کی وجہ سے ہے نہ کہ اتباع کی وجہ سے؛ اس لئے اتباع چاہے کسی بھی امام کی ہو؛ لیکن احترام سبھوں کا ہونا چاہئے :

> ائمہ اجتہاد کا متبع ہمہ وقت اس کا مستحق ہے کہ جس مجتہد کے اتباع پر اس کا یقین بلحاظ دوسرے امام مجتہد کی جانب بدلائل ہو جائے تو اس کے لئے سابق امام کی فقہ سے ہٹ کر دوسرے امام فقہ کا اتباع کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہوگا؛ اس لئے کہ ہر امام فقہ کے مختار مسائل استنباطی ہیں، اور استنباط کا تعلق عقل سے ہے اور عقل احتمال خطاء وصواب سے مبرّا نہیں ہے۔(خطبات خطیب الاسلام: ۱/ ۴۳۰)

مولانا نے اپنے خطبات میں اس بات پر بار بار زور دیا ہے اور توجہ دلائی ہے کہ مدار نجات اور مستحق تبلیغ فقط دین ہے، مذہب فقہی اور مسلک مختار نہ مدار نجات ہے اور نہ مستحق تبلیغ۔(خطبات خطیب الاسلام: ۱/ ۳۱۳)

مولانا نے یہ بات بھی واضح فرمائی ہے کہ تفریق ملت کا بنیادی سبب یہ ہے کہ لوگ دین و مذہب اور مسلک میں فرق مراتب باقی نہیں رکھتے، اگر ان تینوں کو اپنے اپنے دائرے میں رکھا جائے تو یہ بات ملت کے مختلف طبقات میں فکری قُرب پیدا کرنے کا ذریعہ بنے گا۔(دیکھئے: خطبات خطیب الاسلام: ۱/ ۵۱۳)

آپ نے بڑے پتہ کی بات کہی ہے کہ مختلف مکاتب فکر کی پیدائش ایسی بات نہیں ہے جس سے گھبرایا جائے، یہ کثرت علم کا فطری نتیجہ ہے؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

> مکاتب فکر سے آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں، مکاتب فکر وہاں پیدا ہوتے ہیں جہاں کثرت علم ہو، یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے کہ کتاب اللہ جیسی ضخیم وعظیم کتاب اس کے پاس موجود ہے، اور معلم کائنات کی سراپا علم سیرت مقدسہ موجود ہے، اسی کثرت علم کی بنیاد پر اسلام ہی میں مکاتب فکر پیدا ہو سکتے ہیں؛ چنانچہ عہد نبوت میں مکاتب فکر پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے، اور اسی بنیاد پر ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں گے۔(خطبات خطیب الاسلام: ۲/ ۲۱۵)

فقہی مسائل کے علاوہ دوسرے ملی مسائل میں بھی مولانا ہمیشہ اعتدال اور اتحاد کی دعوت دیتے تھے، مثلاً ایک عرصہ سے علماء اور جماعتوں کے کارکنوں کے درمیان کسی قدر دوری پیدا ہوگئی ہے، مولانا نے اس سلسلہ میں دونوں کو تنبیہ کی ہے اور ٹکراؤ سے بچنے کی تلقین فرمائی ہے؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

> علماء اعتراض کریں مبلغین پر، اور مبلغین اعتراض کریں علماء پر، اس سے ضعف اور ٹکراؤ پیدا ہوگا، اور جو کام ہو رہا ہے، وہ بھی رُک جائے گا، اب اگر علماء حضرات جماعت تبلیغ کے مقابل آجائیں اور جماعت تبلیغ مد مقابل علماء کے آجائیں، اور جماعت والے یوں کہیں کہ علماء کا کام صرف یہ ہے کہ وہ مدرسہ میں بیٹھ کر کتابیں پڑھائیں، ان کے پاس دعوت کا کام نہیں ہے، اور علماء یوں کہیں کہ جاہل لوگ تبلیغ کا کام کرتے ہیں، ان کو شعور نہیں ہے تو اس سے ان میں ٹکراؤ پیدا ہوجائے گا۔(خطبات خطیب الاسلام: ۲/ ۵۰۷)

غالباً مولانا کے سامنے بعض ایسے علماء ہوں گے، جنھوں نے تبلیغی جماعت کے کمزور پہلوؤں پر نظر رکھی ہوگی، مولانا نے ان کو ایک اصولی ہدایت فرمائی ہے کہ جب تک کسی کام سے فائدہ ہوتا رہے تو نقائص کی اصلاح کرتے رہنا چاہئے اور فوائد میں رُکاوٹ نہیں بننا چاہئے؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

> تبلیغ کا ایک کام ہو رہا ہے، اور اس کا فائدہ بھی ظاہر ہے، اس میں بعض نقائص بھی ہیں؛ لیکن فوائد بھی ہیں؛ لہٰذا اگر نقائص پر زور دیا گیا تو فوائد بھی بند ہوجائیں گے؛ لہٰذا یہ ہونا چاہئے کہ جو فوائد ہیں، وہ چلتے رہیں اور جو نقائص ہیں ان کی اصلاح کرتے رہیں۔(خطبات خطیب الاسلام: ۲/ ۵۰۸)

بہر حال مولانا کی دعوتِ اعتدال اور دعوتِ اتحاد دونوں ہی وقت کی اہم ضرورت کو پوری کرتی ہے، اور اُمت اور علماء امت کا فریضہ ہے کہ اس دعوت پر لبیک کہیں۔

عام طور پر دینی مدارس سے مربوط اساتذہ اور منتظمین کی فکر مدارس تک محدود ہوتی ہے؛ لیکن مولانا کا دلِ دردمند پوری امت اور بالخصوص نئی نسل کے لئے تڑپتا تھا، وہ چاہتے تھے کہ امت کا ہر بچہ دین کی بنیادی تعلیم حاصل کرلے؛ تاکہ وہ ارتداد وانحراف اور غفلت وکوتاہی کا شکار نہ ہو، اس کے لئے آپ نے جامعہ اردو علی گڑھ کے انداز پر ''جامعہ دینیات دیوبند'' کے نام سے فاصلاتی تعلیم کا ادارہ قائم فرمایا تھا، جس سے ایک زمانہ تک بڑی تعداد میں عصری تعلیم یافتہ حضرات امتحانات دیتے رہے اور اس کا بڑا نفع ہوا، میں خود کئی عصری تعلیم یافتہ حضرات سے واقف ہوں، جو اپنے لٹریچر میں ''فاضل جامعہ دینیات'' لکھا کرتے تھے اور اسے اپنے لئے باعث سعادت سمجھتے تھے، میں اسے ایک رسمی کوشش سمجھتا تھا؛ لیکن اجلاس صد سالہ کی تیاری کے دوران دارالعلوم کی طرف سے آپ حیدرآباد تشریف لائے تھے، یہاں علمائے دیوبند کی تنظیم ''مجلس علمیہ'' نے آپ کے اعزاز میں علماء کی نشست رکھی، جس میں ریاست کے تقریباً تمام ہی علماء جمع تھے، اُس وقت اس ادارہ کے ذمہ دار حضرت مولانا شریف حسین ترمذیؒ تھے،

اِس موقع پر حضرت الاستاذ نے ملک کی موجودہ تعلیمی پالیسی اور اس کے اثرات وخطرات کا بہت بصیرت مندانہ تجزیہ فرمایا، جس سے آپ کے عصری حالات کے شعور کا اندازہ ہوا، پھر آپ نے اس کا حل بتایا کہ جیسے دین کے تفصیلی علم کے لئے مدارس اسلامیہ کا نظام قائم ہے، اسی طرح ایک ایسے نظام کی ضرورت ہے، جو ان لوگوں کے لئے حصول تعلیم کا ذریعہ بنے، جو باضابطہ مدرسہ میں تعلیم حاصل نہیں کر سکتے، پھر اُس پسِ منظر میں ''جامعہ دینیات دیوبند'' کا تذکرہ فرمایا، افسوس کہ ایک عرصہ سے اس ادارہ کی کوششیں موقوف ہیں؛ مگر آج بھی یہ اہم ضرورت ہے، اور اگر دارالعلوم وقف دیوبند اس کا احیاء کرے تو بہت مفید بات ہوگی۔

دینی مدارس کے سلسلہ میں بھی مولانا کی فکر عام روایتی علماء سے کہیں آگے تھی، وہ موجودہ سائنسی اور صنعتی ترقی کے پس منظر میں ایسی دینی درسگاہوں کے قائل تھے، جو عصری اور دینی علوم کی جامع ہوں؛ چنانچہ ۱۸/اکتوبر ۱۹۹۷ء میں منعقد ہونے والی حج کانفرنس میں اپنے صدارتی خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں :

> پیش آنے والے اس دشوار ترین مرحلے کا کامیاب حل اس کے سوا دوسرا نہیں ہے کہ عصری اور دینی علوم کی جامع نئی درسگاہیں قائم کی جائیں اور قدیم صالح اور جدید نافع کے حامل ایسے علماء تیار کئے جائیں، جو اکیسویں صدی کی متوقع زبردست مادی ترقی سے نئی مسلم نسل کے سامنے آنے والے نئے سوالات، نئے شبہات، نئے اعتراضات اور نئے تلبیسات کے نہ صرف جوابات ہی دے سکیں؛ بلکہ ان کے مانوس افکار ونظریات کو ملحوظ رکھ کر ان کی محبوب زبان واصطلاحات کے ذریعہ انھیں مطمئن بھی کر سکیں، اور نئے چیلنجوں کا کتاب وسنت کی روشنی میں معقول دلائل کے ساتھ ان کے تار پود بکھیر سکیں۔ (خطبات خطیب الاسلام: ۲/۱۹۹)

مولانا کا یہ تصور علماء کے لئے قابل توجہ ہے، ہندوستان میں تحریک مدارس کے مؤسس حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ہیں، انہوں نے دارالعلوم کو دینی علوم کی تدریس کے لئے یکسو رکھا؛ کیوں کہ ان کی نظر میں یہ بات تھی کہ عصری علوم کے بہت سے ادارے قائم ہیں، اور حکومت ان کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، دینی تعلیم کے ادارے مٹ رہے ہیں، اور مٹائے جا رہے ہیں؛ لیکن وہ عصری تعلیم کے مخالف نہیں تھے؛ اسی لئے دارالعلوم کے ابتدائی نصاب میں بھی اس کا لحاظ رکھا گیا، نیز سنسکرت زبان، ریاضی، فلکیات، فلسفہ اور طب کو شامل نصاب کیا گیا، نیز آپ نے سرسید احمد خان مرحوم کو خط لکھتے ہوئے یہ بات لکھی کہ مدرسہ عربیہ دیوبند سے فراغت کے بعد فضلاء اگر علی گڑھ جا کر تعلیم حاصل کریں تو یہ ان کے کمال میں اضافہ کا سبب بنے گی؛ لیکن افسوس کہ حضرت نانوتوی کا عرصۂ حیات

بہت کم رہا اور اس کے بعد ملک کے انقلابی حالات اور مسلمانوں کے دین وایمان پر منڈلاتے ہوئے خطرات کی وجہ سے اس جانب توجہ نہیں ہوسکی؛ اس لئے اگر حضرت نانوتوی کے پڑپوتے نے اہل مدارس کو اس جانب متوجہ کیا ہے تو مجھ جیسوں کے لئے چنداں قابل تعجب نہیں، کاش! اہل مدارس اس جانب توجہ کریں۔

مولانا اپنے تلامذہ اور مداحوں کے درمیان ایک متکلم اسلام کی حیثیت سے جانے جاتے تھے؛ لیکن اس متکلم کے اندر ایک داعی کی شخصیت بھی چھپی ہوئی تھی، وہ دعوت اسلام کے کاموں کو بے حد اہمیت دیتے تھے، اور اس کو اُمت کا اساسی کام شمار کرتے تھے؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

> اسلام کا اساسی موضوع دعوت ہے، دعوت ہی وہ واحد موضوع ہے کہ انسان کی ذکر وفکر کی جوہری قوتوں کے فطری مطالبات کی تکمیل یعنی دعوتی ودینی پر مخاطب کی قوت فکر کے مطالبہ دلیل وبرہان کو پورا کرتا اور قوت ذکر کے مطالبہ عروج ہی کی مکمل رہنمائی کرتا ہے؛ لیکن ذکر وفکر کے ان مطالبات کی تکمیل کرنے والے مکمل نظام کی تشکیل، انسانی استطاعت سے باہر ہے؛ کیوں کہ شعور انسانی دینی دعوؤں پر اگر عقلی دلائل وثبوت قائم کر بھی لے، تب بھی اللہ کی ذات وصفات اور عالم غیب تک رسائی کے نظام کی تشکیل نبوت کی رہنمائی کے بغیر خالی ہوگی، اور اس مرحلہ پر آ کر نبوت کی جانب انسان کی احتیاج کی دلیل کی محتاج نہیں رہی۔ (خطبات خطیب الاسلام: ۱/ ۱۰۷)

مولانا کے نزدیک اسلام کی دعوت ہی دین حق کے تحفظ کا ذریعہ ہے، اور اسی قوت نے اسلام کے بدخواہوں کو شکست دی ہے، اور ان کے منصوبوں کو ناکام کیا ہے :

> تاریخ کی انمٹ شہادتوں کے مطابق اسلام ہی وہ واحد زندہ وپائندہ دین ہے کہ ہر دور میں اس کے مٹا دینے کے بدنہاد خواہش مندوں کو صرف اس کی قوت دعوت ہی نے ذلت ناک شکستوں سے دوچار کیا ہے، جس کی اولین بنیادی وجہ یہ ہے کہ اسلام دیگر مذاہب عالم کی طرح صحت وسقم اور صدق وکذب کے احتمالات رکھنے والے محض عقلی فلسفوں پر مبنی نہیں؛ بلکہ اس کی اساس وحی ربانی کے ان فطری اور نفسیاتی اُصولی ہدایتوں پر قائم ہے کہ جو براہ راست سلیم الفطرت انسان پر مؤثر ہونے کے لئے کسی بیرونی مؤید قوت کی ضرورت مند نہیں۔ (خطبات خطیب الاسلام: ۱/ ۱۰۴-۱۰۵)

مولانا نے علماء کو خاص طور پر دعوت دی ہے کہ وہ تبلیغ اسلام کو اپنی جدوجہد کا مرکز بنائیں، اور اسٹیج کو تبلیغ مسلک کے بجائے تبلیغ دین کا ذریعہ بنایا کریں :

دعوت اسلامی ایک حتمی ضرورت ہے، اس کی تکمیل کے لئے عصر حاضر میں من جملہ فرائض یہ بھی ہے کہ مذاہب فقہیہ کی اور مسالک ومکاتب فکر یہ کی تبلیغ کی ممنوعیت کو علماء کرام ایک مستقل حیثیت دیں، اور اس ذوق شرعی کی زیادہ ہمت افزائی فرمائیں کہ علماء کرام اسٹیج پر صرف تبلیغ دین منزل کو اپنائیں، یہی ملت میں فکری وحدت کی بنیاد پر قبول دعوت اسلامی کا واحد وسیلہ بن سکے گا، اور کار دعوت کو خیر القرون کے بابرکت ومؤثر طرز وطریق سے باہر نہ ہونے دیا جائے، اسی طرز نبوت نے فطرت اور شعور انسانی پر اپنی پُر تاثیری کو کسی حجت وبرہان کا ضرورت مند نہیں رہنے دیا۔ (مجموعہ مقالات سیمینار: ۲۵-۲۷ / فروری ۲۰۰۵ء، جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ)

مولانا مسلمانوں کے اندر دین کی طرف دعوت دینے کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور تنبیہ بھی کرتے ہیں کہ علماء کی طرف سے اس تجربہ شدہ بہترین کام کی مخالفت نہیں ہونی چاہئے؛ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اصل میں تبلیغ غیر مسلموں تک دین اور ایمان کی دعوت پہنچانے کا نام ہے؛ چنانچہ اپنے ایک خطاب میں فرماتے ہیں :

تبلیغ احکام حقیقتاً تبلیغ نہیں ہے، اسے مجازاً تبلیغ کہا جاتا ہے، حقیقت میں تبلیغ اس کا نام ہے کہ غیر مسلموں کو دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دی جائے، یہ ایک واقعہ ہے کہ تبلیغ اسلام کا میدان اس وقت خالی سا ہو گیا ہے، گو کچھ جماعتیں کر بھی رہی ہیں، ہر شخص کے لئے ضروری ہے کہ اپنے اپنے رنگ میں دوسروں تک اسلام پہنچائے، پڑھے لکھے ہوں یا بے پڑھے لکھے، بہت سے بے پڑھے لوگوں نے اپنے ذوق سے مل ملا کر سینکڑوں لوگوں کو اسلام کی دولت سے نواز دیا، جن لوگوں میں تبلیغ کرنے کی صلاحیت ہے اگر وہ یہ کہہ کر ٹالتے رہیں کہ فلاں جماعت تبلیغ اسلام کا کام کر رہی ہے تو یہ غلط ہوگا؛ بلکہ ہر شخص کو یہ کرنا چاہئے، اور اس پر دھیان دینا چاہئے۔ (خطبات خطیب الاسلام: ۲/ ۲۱۵)

طریقۂ دعوت کے سلسلہ میں مولانا کا ذہن بہت وسیع ہے، اور وہ کسی ایک طریقہ پر انحصار کو درست نہیں سمجھتے؛ بلکہ ہر دور کے پُر تاثیر طریقہ کو اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہیں؛ چنانچہ اپنے ایک خطاب میں دعوت سے متعلق اہم نکات کا ذکر کرتے ہوئے پانچویں نکتہ کو اس طرح بیان فرمایا ہے :

> عصر رواں میں انسانیت کی اس عظیم خیر خواہانہ خدمت (اسلام کی دعوت وتبلیغ) کے لئے قدرت کے عطا کردہ انٹرنیشنل وسائل علم وخبر کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے جامعات ومدارس کے ارباب بست وکشاد کو وسعت حوصلہ کے ساتھ شرعی حدود میں کام لینا وقت کا اہم اور قابل صد التفات بجا اور برمحل مطالبہ ہے۔(خطبات خطیب الاسلام:۱/۱۷۱)

کاش دعوت اسلام کی جو دعوت مولانا نے علماء کو دی ہے، علماء اس پر غور کریں اور جیسے تعلیم وتعلم کو انھوں نے اپنی کوششوں کا مرکز بنایا ہے، اسی طرح برادران وطن میں بھی دعوت اسلام کی جدوجہد کو اپنی بہترین کوششوں کا حصہ بنالیں۔

دعوت دین کا ایک اہم اور مؤثر ذریعہ میڈیا اور جدید ذرائع ابلاغ ہے، مولانا اس کو بڑی اہمیت دیتے ہیں، اوران کے نزدیک دعوت میڈیا ہی کی ایک تعبیر ہے؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

> قرآن کریم نے میڈیا کے لئے انتہائی وسیع المعنیٰ اور جامع ترین لفظ ''دعوت'' استعمال کیا ہے، جو اس کی تمام اُصول وفروع میں پیوست صادقانہ حیثیت کو واضح کرنے کے لئے ایک ایسا لفظ ہے کہ جس کا بدل کسی زبان ولغت میں موجود نہیں۔(خطبات خطیب الاسلام:۱/۱۶۱)

مولانا اس بات پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ جدید ذرائع ابلاغ ایک تو مسلمانوں کو حاصل نہیں، اور جو میسر ہے، اسلام کے لئے ان کا کما حقہ استعمال نہیں ہورہا ہے، ان کا کہنا ہے کہ اکیسویں صدی میں اسلامک میڈیا مسلمانوں کا بنیادی ایجنڈہ ہونا چاہئے :

> بصد افسوس اس ناقابل انکار حقیقت کا اظہار بھی ناگزیر ہے کہ یہ ضروری ذرائع ابلاغ دنیا کے سب سے پہلے اور سب سے آخری بین الاقوامی دین فطرت اسلام کو کما حقہ میسر نہیں ہیں، اور جس درجہ میں میسر بھی ہیں، تو ان کا استعمال اسلام کے لئے برمحل نہیں ہورہا ہے؛ اس لئے ضروری ہے کہ مسلم ارباب فکر اکیسویں صدی کے استقبالیہ ایجنڈے میں اسلامک میڈیا کو اسی اہمیت کے ساتھ شامل فرمائیں کہ اسلام جس کا بجا طور پر ہی نہیں بلکہ لازمی طور پر مستحق اور ضرورت مند ہے۔(خطبات خطیب الاسلام:۱/۳۵۸)

زبان کی حفاظت جس قدر اس حقیر نے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحبؒ کے یہاں دیکھی، کم ہی دوسری جگہ دیکھنے میں آئی؛ ان کی نجی مجلس میں کبھی کسی کی غیبت نہیں

سنائی دی، اجلاس صد سالہ کے بعد دار العلوم میں جو قصۂ نا مرضیہ پیش آیا؛ اس میں آپ کو اور آپ کے رفقاء کو جس تکلیف دہ مراحل سے گزرنا پڑا، وہ کسی حقیقت آگاہ سے مخفی نہیں ہے؛ لیکن ان دنوں میں اور اس کے بعد بھی کبھی آپ کی زبان پر دوسرے فریق کے بارے میں کوئی ناشائستہ بات نہیں آئی، آپ کی وفات کے بعد دار العلوم دیوبند وقف میں منعقد ہونے والے تعزیتی اجلاس میں حضرت مولانا سید ارشد مدنی دامت برکاتہم نے اپنے خطاب میں خاص طور پر اس خوبی کا ذکر فرمایا کہ انھوں نے زمانہ اختلاف میں بھی کبھی اختلاف رکھنے والوں کے بارے میں نہ ناشائستہ زبان استعمال کی اور نہ کبھی اس کو اپنی تقریر اور تحریر کا موضوع بنایا، حقیقت یہ ہے کہ یہ بہت بڑا وصف ہے، وہ ایسے حالات سے گذرے، جن میں صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور اچھے اچھوں کو اپنے آپ پر قابو نہیں رہ پاتا؛ لیکن آپ اس امتحان میں یقیناً پورے اترے۔

تیسرا وصف اتحاد امت کی کوشش ہے، اس کی دو مثالیں تو بالکل واضح ہیں، ایک یہ کہ دار العلوم کے اختلاف نے پورے حلقہ دیوبند میں ایک تقسیم پیدا کر دی تھی، ایک حلقہ مولانا اور ان کے رفقاء کے ساتھ تھا، اور دوسرا موجودہ انتظامیہ کے ساتھ، مقدمہ چل رہا تھا، بعض رقوم منجمد تھیں، اور کچھ باخبر لوگوں کے بیان کے مطابق مقدمہ میں آپ کا موقف زیادہ مضبوط تھا اور جلد ہی فیصلہ آنے کی امید تھی؛ نیز دار العلوم وقف دیوبند بھی اب استحکام کی منزلیں طے کرنے لگا تھا؛ عین اس وقت آپ نے پیش قدمی کرتے ہوئے حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ کے واسطے سے موجودہ انتظامیہ کو اتحاد کی دعوت دی اور اللہ تعالیٰ مولانا مدنیؒ کو بھی جزائے خیر عطا فرمائے کہ انھوں نے آگے بڑھ کر اس دعوت کا استقبال کیا، اس وقت دار العلوم وقف سخت معاشی بحران سے گزر رہا تھا، اساتذہ کی کئی کئی ماہ کی تنخواہیں باقی تھیں؛ اگر آپ کی طرف سے مطالبہ ہوتا کہ جو رقمیں منجمد ہیں، وہ پوری کی پوری یا ان کا نصف دار العلوم وقف کو مل جائے اور کتب خانہ بھی آدھا انھیں دے دیا جائے تو بظاہر نئی انتظامیہ اسے بخوشی قبول کر لیتی اور وقتی طور پر دار العلوم وقف کی معاشی دشواریوں کا کچھ مداوا بھی ہو جاتا، اسی طرح اگر آپ کی طرف سے دار العلوم کی شوریٰ کی رکنیت کی شرط عائد کی جاتی تو مقدمہ کی الجھنوں کو ختم کرنے کے لئے شاید اسے بھی قبول کر لیا جاتا؛ بلکہ بعض حضرات سے معلوم ہوا کہ حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ ایسا چاہتے بھی تھے؛ لیکن مولانا نے اپنی طرف سے کسی قسم کا کوئی مطالبہ نہیں رکھا اور ایک طرفہ طور پر پوری منجمد رقم اور کتب خانہ سے دستبردار ہو گئے اور وہ حُسنِ کردار پیش کیا جو حضرت نانوتوی کے حفید سعید ہونے کی حیثیت سے آپ کے شایانِ شان تھا، اس موقع پر آپ نے حضرت مولانا اسعد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو جو مکتوب لکھا، وہ پڑھنے کے لائق ہے :

محترم ومکرم جناب مولانا اسعد مدنی صاحب ! زیدت حسناتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جواباً مکتوب گرامی نے ممنون بھی فرمایا اور مسرور بھی، جماعت کی ایک اہم ترین ضرورت کومحسوس فرماتے ہوئے آپ نے اختلافات ختم کرنے کے بارے میں تائیدی کلمات تحریر فرمائے، اور احقر کی قدیم آرزو کی تکمیل کومتوقع بنا کر مسرت کو مضاعف فرما دیا ہے، جماعتی وقار اور مسلکی روایات اکابر کی مجروحیت کا سد باب، اختلافات کو یکسر ختم کر دینے میں ہی مضمر ہے، احقر کے خیال میں عمر کے مراحل نہائی میں پہنچ جانے پر ہماری مشترک خواہش وکوشش یہی ہونی چاہئے کہ ہم اپنے بعد آنے والی نئی نسل علماء کو اختلافات کی یہ نامبارک وراثت دے کر نہ جائیں؛ بلکہ حسب روایت اسلاف کرام کے باہم اتحاد واتفاق، فکری وعملی وحدت اور مخلصانہ مشترک جذبات خدمت علم ودین دیگر بتوفیق الٰہی ایک اہم ترین جماعتی فریضے سے سبکدوش ہوکر بارگاہ رب العزت میں حاضر ہوں، آپ کی صحت کے لئے دعاء گو ہوں اور دُعاء کا خواستگار ہوں۔ والسلام

محمد سالم قاسمی

(مہتمم دار العلوم وقف دیوبند)

سننے میں آیا کہ بعد میں پیدا ہونے والے بعض اختلافات کے پس منظر میں اختلاف دور کرنے کے لئے جماعت دیوبند کی سب سے بزرگ شخصیت ہونے کی حیثیت سے آپ کو دار العلوم کا اہتمام اور جمعیۃ علماء ہند کی صدارت بھی پیش کی گئی؛ لیکن آپ نے خوش اسلوبی کے ساتھ معذرت کردی، جب بھی دار العلوم کی تاریخ لکھی جائے گی، اس میں حضرت نانوتوی کے جذبہ ایثار اور عہدوں سے استغناء کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ ان کی تیسری پشت میں پیدا ہونے والی اس شخصیت کا بھی سنہرے حروف میں ذکر کیا جائے گا۔

دوسرا واقعہ ''مسلم مجلس مشاورت'' کا ہے، باہمی اختلاف کی بنیاد پر مجلس مشاورت کے بھی دو ٹکڑے ہو گئے اور ایک ٹکڑا آپ کی زیر صدارت کام کرنے لگا؛ بظاہر مشاورت میں آپ سے بڑھ کر صاحب وجاہت اور صاحب علم کوئی اور شخصیت نہیں تھی؛ یہاں بھی آپ نے اس بکھرے ہوئے شیرازہ کو جمع کرنے کے لئے آگے بڑھ کر خود اپنے عہدہ سے سبکدوشی اختیار کی اور سبھوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا؛ تاکہ ملت کی ایک تنظیم اختلاف وانتشار سے بچ جائے، مولانا کا یہ وصف بے حد قابل تقلید ہے، کاش، موجودہ دور میں علماء اور ملی قائدین اس کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنائیں!

اس حقیر کا آپ سے زمانہ طالب علمی میں تو صرف درس گاہ میں تلمذ کا تعلق رہا، نہ زیادہ ملاقات کی نوبت آئی اور نہ آپ کے یہاں زیادہ آمد ورفت کا سلسلہ رہا؛ لیکن فراغت کے بعد اس حقیر کی طرف سے محبت وعقیدت اور آپ کی طرف سے شفقت وعنایت بڑھتی گئی، اس حقیر کی دعوت پر اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) اور المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کی سرپرستی قبول فرمائی، معہد کے قیام پر دعاء کے لئے خط لکھا تو بڑے حوصلہ افزاء جواب سے نوازا، جب حضرت مولانا مفتی احمد علی سعیدؒ کی وفات ہوئی اور دارالعلوم وقف میں صدر مفتی کا عہدہ خالی ہوا تو بالواسطہ آپ کی طرف سے اس عہدہ کی پیش کش بھی ہوئی، یہ اس حقیر پر آپ کے اعتماد اور حسن ظن کی بات ہے، تنظیم ابناء قدیم نے حضرت نانوتویؒ کی شخصیت پر ایک اہم سمینار منعقد کیا، اس میں میرا مقالہ حضرت نانوتویؒ کی فقہی بصیرت اور اعتدال پر تھا، سیمینار کے آخر میں جب ملاقات ہوئی تو حوصلہ افزائی کے کلمات کہے، پھر دارالعلوم وقف میں حکیم الاسلامؒ سمینار منعقد ہوا، اس موقع پر راقم الحروف نے ''حضرت حکیم الاسلام اور دفاع عن الدین'' کا عنوان اختیار کیا، مقالہ سننے کے بعد فرمایا کہ آپ نے اصل فکر قاسمی کو سمجھا ہے اور مختلف تحسینی فقرے کہے، جب تک صحت رہی اور کوئی غیر معمولی عذر پیش نہیں آیا، اکیڈمی کے سمیناروں میں شرکت فرماتے رہے اور اس کے لئے طویل سفر کی مشقت بھی گوارا کرتے رہے، ہر سمینار میں آپ کا خطاب اصولی اہمیت کا حامل ہوتا اور شرکاء کے لئے مشعل راہ کا کام کرتا، پھلواری شریف پٹنہ میں منعقد ہونے والے سمینار میں آپ کے دائیں بائیں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ اور حضرت مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کی نشستیں تھیں، آپ نے فرمایا کہ میں اس وقت برصغیر کے دو سب سے بڑے فقہاء کے درمیان بیٹھا ہوا ہوں اور اکیڈمی کی خدمات کو خوب سراہا، پھر جب دارالعلوم وقف کی شوری بنی تو از راہ کرم اِس حقیر کو بھی اس میں شامل فرمایا، اس حقیر نے جب ''آسان تفسیر قرآن مجید'' کا کام مکمل کیا تو آپ سے اس پر پیش لفظ لکھنے کی درخواست کی، آپ نے باوجود ضعف ومصروفیت کے اس کو قبول فرمایا اور اس حقیر کے لئے اس کی حیثیت سے اونچے کلمات تحریر فرمائے، حیدرآباد کے ایک فاضل دیوبند محبی مولانا محمد یامین صاحب نے آپ کے خطبات مرتب فرمائے اور انہوں نے کسی سے پیش لفظ لکھوانے کا مشورہ کیا تو اس حقیر کے بارے میں مشورہ دیا کہ اس سے لکھوالو، بحمد اللہ یہ مجموعہ میری کم سواد تحریر کے ساتھ شائع ہوا ہے، اور اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

ایسا لگتا تھا، جیسے ہر دن آپ کی شفقت بڑھتی جاتی ہو، جب بھی ملاقات کے لئے حاضر ہوتا، دیر تک گفتگو کرتے، ایسی ہی ایک شامِ سعادت اس وقت طلوع ہوئی، جب میں حاضر خدمت ہوا، اور آپ نے احسان وسلوک کے راستہ میں اپنی اجازت وخلافت کا پروانہ ایک بند لفافہ میں عطا کیا اور فرمایا: اسے بعد میں پڑھ لیجئے گا، یہ ١٤ر شوال المکرم ١٤٣٣ھ مطابق ٢ر ستمبر ٢٠١٢ء کی تاریخ تھی، حضرت الاستاذ کے گرامی نامہ کے الفاظ یہ ہیں:

اخی فی اللہ مولانا خالد سیف اللہ صاحب !

زادکم اللہ صلاحاًواصلاحاًووفقکم اللہ لما فیہ خیر الاولیٰ والآخرۃ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے علمی اور دینی ذوق وشوق کے ساتھ، احقر کی نگاہ آپ کے عقائد صحیحہ، اخلاق فاضلہ اور اعمال صالحہ پر بطور خاص رہی ہے، الحمد للہ کہ حق تعالیٰ نے آپ کو حُسن نیت کے ساتھ خصوصیات مذکورہ سے نواز کر مصلحیت کی صلاحیت بھی عطا فرمائی ہے؛ اس لئے میں اطمینان قلبی کے تحت بطریقِ اسلافِ صالحین —— دارین میں صلاح وفلاح کی دُعاء کے ساتھ —— آپ کو اجازت دیتا ہوں کہ طالبین بیعت کو آپ توبہ کرادیا کریں، اور ان کو عقائد صحیحہ پر مضبوطی سے قائم رہنے اور بدعات سے بچنے کی پوری قوت اور اصرار سے ہدایات دے کر اپنے سلسلے کے اوراد ذیل کی تلقین کردیا کریں، اصطلاحاً اس اجازت کو خلافت سے بھی تعبیر کرتے ہیں......دُعاؤں میں یاد رکھیں :

اللّٰھم وفقنا لما تُحب وترضیٰ وأن تجعل آخِرتنا خیرا من الأولیٰ وأسأل اللہ تعالیٰ أن یجعلنا ناصري طریقه المستقیم وصلی اللہ علیٰ خیر خلقه مُحمد وآله وأصحابه أجمعین .

(حضرت مولانا) محمد سالم قاسمی (صاحبؒ)

(مہتمم: دارالعلوم وقف دیوبند)

اگرچہ میری نظر میں یہ بھی آپ کی شفقت، حسن ظن اور حوصلہ افزائی ہی کا مظہر ہے؛ ورنہ ''من دانم کہ من آنم'' لیکن میرے لئے یہ بڑی سعادت بختی کی بات تھی؛ کیوں کہ یہ علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ احسان وتصوف کے باب میں بھی نسبت قاسمی کا حصول تھا، جو دو واسطوں سے حضرت تھانویؒ اور حضرت تھانویؒ کے واسطے سے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ تک پہنچتا ہے، جو اس راہ میں حلقہ دیوبند کے میر کارواں تھے، اللہ تعالیٰ اس اعتماد کے تقاضوں کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

حضرت الاستاذ جہاں علوم ظاہری کے میدان میں ایک کامیاب رہبر تھے، وہیں احسان وسلوک کی راہ میں بھی آپ کا پایہ بلند تھا، آپ ابتداءً والد ماجد کے اشارہ پر حضرت شاہ عبد القادر رائے پوریؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے؛ لیکن تربیت خود اپنے والد ماجد سے پائی، اور والد صاحب سے اجازت یافتہ ہوئے، آپ نے اپنے والد

صاحب سے متعلق اہل ارادت کی بھی تربیت فرمائی، اور خود آپ سے جولوگ بیعت ہوئے، اُن کی بھی، آپ نے اس راہ میں جن لوگوں کو اجازت سے سرفراز کیا ہے، ان کی تعداد پچاس ہے، (دیکھئے سیرت وشخصیت، خطیب الاسلام: ۱/ ۳۵۲) تلاوتِ قرآن مجید اور ذکر کی کثرت کا بڑا اہتمام تھا، یہ بات میں نے سفرحج کے دوران بھی دیکھی اور بعض اور مواقع پر بھی، خاص کر راہ سلوک کے سب سے بڑے عمل ''لایعنی باتوں سے احتراز'' کا تو قدم قدم پر مشاہدہ ہوتا تھا۔

کچھ عرصہ پہلے جب میرے لڑکے مولانا عمر عابدین قاسمی سلمہ مدینہ منورہ میں زیر تعلیم تھے، تو انھوں نے مشہور محدث شیخ محمد عوامہ حفظہ اللہ کے صاحبزادے ڈاکٹر محی الدین محمد عوامہ کے سامنے یہ بات رکھی کہ عالم عرب میں علمائے دیوبند کی خدمات کا تعارف کرانا چاہئے؛ کیوں کہ منظم طور پر ان کے بارے میں بدگمانی پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے؛ چنانچہ ان کے درمیان یہ بات طے پائی کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے نام سے ایک ''عالمی ایوارڈ'' کا سلسلہ شروع کرنا چاہئے، پھر ان حضرات نے یہ مشورہ شیخ محمد عوامہ اور راقم الحروف کے سامنے رکھا، مجھے بھی یہ رائے پسند آئی، اور طے پایا کہ ''جائزۃ الامام محمد قاسم النانوتویؒ'' کے نام سے اہم علمی شخصیتوں کو یہ ایوارڈ پیش کیا جائے، جائزہ کمیٹی کا سرپرست شیخ محمد عوامہ کو، صدر اس حقیر کو، جنرل سکریٹری ڈاکٹر محی الدین محمد عوامہ کو اور سکریٹری مولانا عمر عابدین قاسمی کو منتخب کیا گیا۔

پہلا ایوارڈ ترکی کے ایک بڑے مصلح اور معروف شخصیت شیخ خالد آفندی نقشبندی کو استنبول میں پیش کیا گیا، ایوارڈ کے لئے یہ نام شیخ عوامہ کی طرف سے آیا تھا اور اسے سب نے قبول کیا، دوسرے ایوارڈ کے لئے کئی نام زیر غور تھے، راقم الحروف نے حضرت الاستاذؒ کا نام پیش کیا، اُن کے علمی مقام، تعلیمی واصلاحی خدمات اور حضرت نانوتویؒ سے نسبی تعلق کی بناء پر سبھوں نے اس سے اتفاق کیا، دارالعلوم آزاد وِل ساؤتھ افریقہ میں تفویضِ جائزہ کی یہ عظیم الشان تقریب منعقد ہوئی، جس میں تقریباً ۱۰۰ ملکوں کے نمائندہ علماء نے شرکت کی، یہ میرے لئے دو وجہ سے مسرت کا باعث تھا، ایک یہ کہ یہ ایوارڈ حضرت الاستاذ کے لئے ''حق بحقدار رسید'' کا مصداق تھا، دوسرے: ایک درجہ میں مجھے اس کا ذریعہ بننے کی سعادت نصیب ہوئی، اس کے علاوہ آپ کو حکومت مصر کی طرف سے ''برصغیر کے ممتاز عالم کا ایوارڈ'' اور شاہ ولی اللہ اکیڈمی کی طرف سے ''شاہ ولی اللہ ایوارڈ'' بھی ملا تھا؛ لیکن اصل ایوارڈ وہ ہے، جو انشاءاللہ ان کو ان کے رب کریم کے حضور ملا ہوگا۔

آپ کی صحت وفات سے کچھ عرصہ پہلے تک بھی بہتر تھی، اگرچہ ضعف بڑھ گیا تھا، مگر ذہنی استحضار اور فکری قوی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، صرف آخری دنوں میں ذہول کی کیفیت بڑھ گئی تھی؛ لیکن اب بھی چہرہ ایسا روشن اور پُررونق تھا کہ بیماری کا کوئی اثر نظر نہیں آتا تھا، آخر گلشن قاسمی کے اس شجر سایہ دار سے ملت اسلامیہ

٢٦ر رجب ١٤٣٩ھ مطابق ١٤ر اپریل ٢٠١٨ء کو محروم ہوگئی، صاحب زادۂ محترم برادرِ گرامی قدر حضرت مولانا محمد سفیان قاسمی زید مجدہم (مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند) نے دارالعلوم کے احاطہ میں نماز جنازہ پڑھائی اور شرکاء کا ایسا اژدحام ہوا کہ دیوبند اور مضافات کے اضلاع کی تو گویا ساری خلقت ٹوٹ پڑی تھی، اس کے علاوہ ملک کے دوسرے علاقوں سے بھی ممتاز شخصیتیں پہنچ گئی تھیں، اور آپ کا جسد خاکی زبانِ حال سے کہہ رہا تھا :

ڈھوڈوگے ہمیں ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم!

•••

مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ — ایک معروضی مطالعہ

مولانا محمد اعظم ندوی ☆

تعارف کتاب

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحبؒ (١٣٢٦-١٤٢٣ھ،١٩٠٨-٢٠٠٢ء) نے تالیف وتصنیف کے میدان میں نئی نئی جہتیں نکالی ہیں، وہ پامال راہوں پر کم چلے ہیں، ان کے قلم تحقیق رقم سے نادر موضوعات پر بیش قیمت اور ٹھوس علمی کام منظر عام پر آتے رہے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو بافیض بنایا، ان کے بہت سے کاموں نے مرجع کی حیثیت حاصل کی؛ چنانچہ ان کی تحقیقات کو کسی تعارفی مقدمہ یا تقریظ کی ضرورت نہیں پڑی، ان کا کام خود بولتا ہے، اور ذوق تحقیق رکھنے والے طالب علموں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اس سے استفادہ کریں، شاید یہ ان کی سب سے بڑی کامیابی ہے، انھیں نوادرات علمی میں ایک کتاب ''مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ للعہد النبوی والخلافۃ الراشدۃ'' ہے، جس میں ٦٣٦ دستاویزات ہیں، اگرچہ نمبر شمار کے اعتبار سے کتاب میں ٣٧٣ ہی ہیں؛ لیکن کئی دستاویزات میں ایسا ہوا ہے کہ بعد کے ایڈیشن میں سابقہ نمبر کو باقی رکھتے ہوئے (الف، ب، ج) لکھ کسی اضافی فائدہ کی بنیاد پر مکرر یا تین چار طریقہ سے بھی ایک ہی تحریر کو نقل گیا ہے، اس طرح ان کی تعداد زیادہ ہوجاتی ہے، یہ دستاویزات درج ذیل ٧ موضوعات سے متعلق ہیں :

(١)　معاہدات یا معاہدات کی تجدید۔
(٢)　دعوتِ اسلام۔
(٣)　عمال کے تقررات اور ان کے فرائض۔
(٤)　اراضیات اور ان کی اجناس وغیرہ کے معافی نامے۔
(٥)　صلح وامان اور وصیت۔
(٦)　چند خاص لوگوں کے حق میں کچھ مخصوص معاملات میں گنجائش پر مشتمل تحریریں۔
(٧)　متفرقات جن میں بعض وہ خطوط بھی ہیں جو مکاتیب نبوی کے جواب میں آئے۔

☆　استاذ: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

کتاب کے ایڈیشن

میرے پیش نظر کتاب کے اصل عربی نسخہ کا چھٹا ایڈیشن ہے، جس کا سن طباعت ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۹۸۷ء ہے، اور یہ درمیانی سائز کے ۷۵۷ صفحات پر مشتمل ہے، یہ دارالنفائس، بیروت، لبنان سے چھپا ہے، اس سے پہلے بھی اس کے دو ایڈیشن، طبع چہارم ۱۴۰۱ھ مطابق ۱۹۸۰ء میں اور طبع پنجم ۱۴۰۵ھ مطابق ۱۹۸۵ء میں اسی کتاب گھر سے شائع ہوئے ہیں، اور اس کے بعد اس کا ساتواں ایڈیشن بھی یہیں سے ۱۴۲۲ھ مطابق ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا ہے، اور اس پر پہلی بار بین الاقوامی معیاری کتابی عدد (ISBN) بھی لکھا گیا ہے، اور وہ یہ ہے: (ISBN 9953-18-038-5)، جب کہ یہ پہلی بار عربی زبان میں لجنۃ التالیف والترجمہ، قاہرہ، مصر سے ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۱۴۱ء میں شائع ہوا، اور دوسری بار بھی ۱۳۷۶ھ مطابق ۱۹۵۶ء میں یہیں سے چھپا، تیسرا ایڈیشن دارالارشاد، بیروت سے ۱۳۸۷ھ مطابق ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا، پھر مسلسل چار ایڈیشن دارالنفائس سے چھپ چکے ہیں، جیسا کہ ابھی ذکر آیا۔

فرانسیسی اور اُردو ترجمے

ان دستاویزات کا فرانسیسی ترجمہ بھی ڈاکٹر صاحب نے خود شائع کیا، جس کے ساتھ ان کی تاریخی حیثیت پر سیر حاصل بحث کی، جس کا عنوان تھا: Documents sur la diplomatic musulmane a l`epoque du Prophete des khalifes orthodoxes، جس پر انھیں ۱۳۵۳-۵۴ھ مطابق ۱۹۳۵ء میں یونیورسٹی آف پیرس سے پی، ایچ، ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی، جو اسی سال Maisonneuve پیرس سے شائع ہوئی، (مجموعۃ الوثائق: ص۲۶) عربی میں تو اس کا اصل مسودہ تھا ہی، اُردو زبان میں بھی اس کا ترجمہ ''آنحضرت ﷺ کے فرامین، معاہدات، مکاتیب اور خلفاء راشدین کے احکام، سیاسی وثیقہ جات از عہد نبوی تا بہ خلافت راشدہ'' کے عنوان سے شائع ہوا، جس کے مترجم مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی ہیں، مترجم کے مقدمہ پر ۱۲/اپریل ۱۹۶۰ء کی تاریخ درج ہے، شاید پہلی بار اسی سال چھپی ہو، میں نے اس کا دوسرا ایڈیشن دیکھا ہے جو حکومت پنجاب کے محکمۂ اطلاعات کے تعاون سے ۲۰۰۵ء میں مجلس ترقی ادب لاہور سے ۳۳۰ صفحات میں شائع ہوا ہے۔

کتاب کے مندرجات

طبع ششم پہ پانچ مقدمات خود ڈاکٹر صاحب کے قلم سے موجود ہیں، چھٹے ایڈیشن کا کوئی اضافی مقدمہ نہیں،

تیسرے مقدمہ پر رجب ۱۳۸۷ھ کی تاریخ درج ہے، چوتھے پر ۵/ذی الحجہ ۱۴۰۱ھ، پانچویں پر یوم میلاد النبی ۱۴۰۵ھ کی تاریخیں درج ہیں، یہ تینوں مقدمے پیرس میں لکھے گئے ہیں، پہلے اور دوسرے مقدمات پر تاریخیں موجود نہیں ہیں؛ البتہ پہلے مقدمہ پر نام کے ساتھ مقام جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، دکن کا ذکر ہے۔

ان مقدمات کے بعد ایک صفحہ میں کتاب میں استعمال ہونے والے رموز واشارات کی وضاحت کی گئی ہے، جیسے ''بث'' سے مراد ابن اثیر کی ''اسد الغابۃ''، ''بج'' سے مراد ابن حجر کی ''الاصابۃ''، ''طب'' سے ''تاریخ طبری''، ''قلقش'' سے ''قلقشندی''، ''س'' سے ''سطر''، ''ص'' سے ''صفحہ اور ''انظر'' سے جدید تحقیقات کی طرف اشارہ وغیرہ، اس کے بعد تین صفحات میں عربی مجموعہ اور اس کے فرانسیسی ترجمہ میں دستاویزات کے نمبرات میں جو فرق ہے اس کی فہرست دی گئی ہے۔

کتاب میں چار ابواب ہیں، جو ''القسم'' کے عنوان سے ہیں، پہلی قسم میں وہ دستاویزات ہیں جو ہجرت سے پہلے کی ہیں، جو کتاب کے بارہ صفحات پر مشتمل ہیں، سب سے پہلے خط کا عنوان ''الی النجاشی فی شان مهاجری الحبشه'' ہے، یعنی مہاجرین حبشہ کے سلسلہ میں نجاشی کو لکھا گیا مکتوب نبوی ہے، اس کے علاوہ اور ۸/دستاویزات ہیں، گویا ان کی مجموعی تعداد ۹ ہے، جن میں وہ تحریر بھی ہے جو قریش نے بنو ہاشم کے بائیکاٹ کے لئے لکھی تھی، اور بیعت عقبۂ اولیٰ، ثانیہ اور ثالثہ کے مواقع سے رسول اللہ ﷺ کی دی گئی زبانی ہدایات کو بھی دستاویزی شکل میں لکھ دیا گیا ہے؛ چوں کہ یہ بھی ایک طرح کا معاہدہ اور آئندہ قائم ہونے والی اسلامی حکومت کی تیاری سے متعلق تھیں۔

دوسری قسم ہجرت کے بعد کی دستاویزات سے متعلق ہے، جس میں ۳۶۸ دستاویزات ہیں، جن میں میثاق مدینہ کے علاوہ ارتداد سے تحریریں، یہود مدینہ، روم وایران، ان کی ذیلی حکومتوں اور مختلف عرب قبائل سے ہونے والے معاہدات کی دستاویزات یا ان سے متعلق مکاتیب نبوی شامل ہیں، قابل ذکر ہے کہ اس باب میں خطبۂ حجۃ الوداع کو دستاویزی شکل میں پیش کر دیا گیا ہے؛ چوں کہ وہ بھی انسانی حقوق کا چارٹر کہلاتا ہے، اور دفعہ وار ان کا معرض تحریر میں آنا ضروری تھا، گویا اپنی اصل کے اعتبار سے وہ خطبہ ہے تحریر نہیں۔

تیسری قسم خلافت راشدہ سے متعلق ہے، جس میں صفحہ ۳۶۹ سے ۵۴۴ تک خلفاء راشدین کے خطوط، فرامین اور دیگر دستاویزات کے علاوہ حضرت معاویہؓ کا بھی ایک خط ہے جو انھوں نے امیر شام کی حیثیت سے قیصر روم کو صفین کے زمانہ میں تحریر فرمایا تھا، اسی طرح خلفاء راشدین سے مراسلت کے ضمن میں دیگر صحابۂ کرامؓ کے خطوط بھی اس باب میں نقل کئے گئے ہیں، ان دستاویزات کی مجموعی تعداد ۲۳۳ ہے۔

چوتھی قسم مختلف ضمیموں پر مشتمل ہے، جن میں حضرت معاذ بن جبلؓ کے فرزند کے انتقال پر حضور اکرم ﷺ کی ایک تعزیتی تحریر کے علاوہ یہود ونصاری اور مجوسیوں کے ساتھ کئے گئے ان نبوی معاہدات کا ذکر ہے جن کی نسبت حضور ﷺ کی طرف مصنف کے نزدیک یقینی نہیں، تاہم چوں کہ ان کی نسبت ذات نبوی کی طرف کی جاتی ہے اس لئے ان پر تنقید وتبصرہ اوران کے جعلی ہونے کی صراحت کے لئے ''ذکر ما نسب الی النبی ﷺ'' کے عنوان سے ذکر کردیا گیا ہے، (مجموعۃ الوثائق:ص ۲۸) پہلا ضمیمہ حضرت سلمان فارسیؓ کے مجوسی رشتہ داروں کو حضور اکرم ﷺ کے لکھے گئے ایک عہدنامہ سے متعلق ہے، دوسرا ضمیمہ یہودیوں اور تیسرا عیسائیوں سے معاہدات پر مشتمل ہے، جو نبی آخرالزماں کی طرف سے منسوب ہے، ایک عہدنامہ آرمینیا کے عیسائیوں کے لئے بھی ترکی ترجمہ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، اور کاتب حضرت معاویہؓ ہیں، اس پر ڈاکٹر صاحب نے یہ تنقید کی ہے کہ آرمینیا ۲ھ میں فتح بھی نہیں ہوا تھا، اور دوسری تحریروں کو بھی موضوع بتایا ہے، ان ضمیموں کی تعداد ۱۰ ہے۔

اس کے بعد شرح الفاظ کے عنوان سے ص:۵۷۹ سے ۶۴۴ تک کتاب میں وارد ہونے والے کم وبیش ۵۰۰ الفاظ کی فرہنگ دی گئی ہے، جن میں بیشتر ابن منظور کی ''لسان العرب'' سے منقول ہیں، جیسا کہ مصنف نے خود صراحت کردی ہے۔ (مجموعۃ الوثائق:ص ۵۷۹)

اس کے بعد تذکرۃ المصادر کے عنوان سے Bibliography دی گئی ہے، اس میں نمبر شمار موجود نہیں، ویسے تقریباً ۳۰۰ سے زائد مراجع کا ذکر آیا ہے، پھر اشخاص ومقامات وغیرہ کا اشاریہ ہے، پھر انساب کی بھی فہرست ہے جس میں صحابۂ کرامؓ اور بعض دیگر شخصیات کے قبائل کا تذکرہ ہے، پھر ایک اور ملحق (ضمیمہ) دیا گیا ہے، جس میں چوتھے ایڈیشن کو بنیاد بنا کر پانچویں ایڈیشن میں جو تصحیحات، اضافے اور استدراکات کئے گئے ہیں ان کو نقل کیا گیا ہے، اس کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ کتاب کے اصل متن کو چھیڑے بغیر صفحہ اور سطر نمبر دے کر یہ بیان کردیا گیا ہے کہ مندرجات میں کہاں کیا اضافہ یا تصحیح کرکے پڑھنا ہے، اس میں ضمناً ۲۶ دستاویزات کا اور اضافہ ہوگیا ہے۔

فہرست کتاب کے اخیر میں کتاب میں آنے والے نقشوں کی بھی فہرست ہے، جن کی تعداد ۹ ہے، اور ایک ورق کو کتاب کی پشت کے اندرونی حصہ سے ملحق کیا گیا جس میں عرب عاربہ (قحطانی یمنی) اور عرب مستعربہ (عدنانی حجازی) دونوں سے متعلق قبائل کا شجرہ دیا گیا ہے، نجاشی، ہرقل، مقوقس، کسری اور منذر بن ساوی اسی طرح جلندی کے دو بیٹے شاہ عمان جیفر اور اس کے بھائی عبد کے نام مکاتیب نبوی کی اصل کاپی کے فوٹو مختلف النوع ذرائع سے حاصل کرکے ان کے فوٹو ثبت کئے ہیں جو کتاب میں ان کے متعلقہ مقامات پر دیکھے جاسکتے ہیں، اوراس میں مؤلف نے بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے۔

اس تالیف کا محرک

پہلے ایڈیشن کے مقدمہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب کی تالیف کا اصل محرک مؤلف کا یہ ایقان تھا کہ عہد نبوی دنیا کی سیاسی، مذہبی اور اقتصادی تاریخ میں انتہائی دوررس نتائج کا حامل رہا ہے، اور یہ ممکن نہیں کہ کسی عہد کے سیاسی حالات کما حقہ سمجھے جاسکیں جب تک کہ اس دور کی سرکاری دستاویزات کا مطالعہ نہ کیا جائے، اسلام سے پہلے عربوں کی کوئی منظم حکومت نہ تھی، جب کہ اسلام نے بڑی تیز رفتاری سے دور دراز علاقوں کو اپنے زیرنگیں کرلیا، اور یہ کام وہ بھی منظم طور پر بین قومی تعلقات کے بغیر نہیں ہوسکتا، اور ایسے وسیع تعلقات بغیر خط وکتابت اور معاہدات وغیرہ کے نہیں ہوتے، اوراس کی واقعاتی شہادت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس صندوق بھر عہد ناموں کے نسخے تھے، جو ۸۲ھ میں جماجم کی جنگ کے موقع سے خاکستر ہوگئے، اور جو بچے وہ زمانہ کی دست برد اور تاتاریوں کی یورش کی نذر ہوگئے، اس لئے مقوقس، منذر بن ساوی اور نجاشی کو لکھے گئے مکاتیب نبوی کو چھوڑ کر جن کی اصل کی دریافت مستشرقین نے کی ہے حضور اکرم ﷺ کے اور خطوط کی اصل نہیں ملتی؛ لیکن حدیث وتاریخ کے راویوں نے ان کے تذکرے اپنے واسطوں سے ہمارے لئے محفوظ کردیئے ہیں، اس لئے ان کا جمع کرنا اوران کے صحت وسقم پر بحث کرنا ایک اہم کام ہے۔(۱)

مصادر ومراجع

مؤلف کے مراجع میں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ۳۰۰ سے زیادہ کتابیں، رسائل اور دستاویزات ہیں، جن میں عربی، اُردو، فارسی، ترکی، انگریزی، فرانسیسی، جرمن، روسی، ولندیزی (Dutch) ۹ رزبانوں سے استفادہ کیا گیا ہے، ان میں سے اکثر زبانوں کی مطبوعات ومخطوطات دونوں سے فائدہ اُٹھایا گیا ہے، تاہم مؤلف نے نبوی دستاویزات کے لئے سب سے زیادہ اعتماد ''طبقات ابن سعد'' پر کیا ہے، جب کہ خلفاء راشدین کی دستاویزات کے لئے بلاذری کی ''فتوح البلدان'' سے زیادہ مراجعت کی ہے، اسی طرح ابوعبید قاسم بن سلاّم کی مشہور کتاب ''کتاب الاموال''، امام ابو یوسف کی ''کتاب الخراج'' اور ''سیرت ابن ہشام'' بھی اسی کتاب کے بنیادی مراجع میں شامل ہیں، شیخ ابن طولون کی ''اعلام السائلین عن کتب سید المرسلین''، عبدالمنعم خاں کی ''رسالات نبویۃ'' اور عبدالجلیل نعمانی کی ''فرمان نبوت'' کو بھی مؤلف نے اپنے اہم مراجع میں شمار کیا ہے، کئی مراجع کا تذکرہ مراجع کی فہرست میں نہیں آسکا ہے، جیسے حافظ ابن حجر کی ''المطالب العالیۃ'' جب کہ متعلقہ مقام پر اس کا ذکر ہے۔

---

(۱) مجموعۃ الوثائق: ص ۲۴۔

قابل ذکر ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے علاوہ مستشرقین اور دیگر مصنفین سے بھی خوب استفادہ کیا ہے، حتیٰ کہ انھوں نے مجوسیوں سے متعلق نبی ﷺ سے منسوب ایک مکتوب مشہور مجوسی شخصیت جمشید جی جیجی بھائی نیت (Sir Jamshedji Jeejiboy Knight) سے بھی نقل کیا ہے، اگر چہ اس کے استناد پر تنقید کی ہے۔

کتاب کا منہج اور معیارِ صحت

یہ کتاب اگر چہ اپنے موضوع پر اساسی مرجع کی حیثیت اختیار کر چکی ہے؛ لیکن کتاب میں بہت سے ضروری تحریریں نہیں آسکی ہیں، جیسے خلفاء راشدین کے زمانہ کی فتوحات سے متعلق دستاویزات کا استیعاب نہیں ہوسکا ہے، اسی طرح ڈاکٹر صاحب نے بجائے اس کے کہ دستاویزات کی صحت کے لئے محدثین کے طریقہ پر ان کے راویوں کی عدالت وضبط اور اتصال سند کو بنیاد بنائیں انھوں نے اُسلوب کو بنیاد بنایا ہے کہ اگر صنعت وتکلف سے آزاد ہے تو صحیح ہونے کا امکان ہے، تکلف وصنعت ہے تو بعد کی ایجاد ہے؛ جب کہ انھوں نے بعض دستاویزات ابن درید کی ''الاشتقاق''، ابن سیدہ کی ''المحکم'' اور ابن منظور کی ''لسان العرب'' وغیرہ سے بھی نقل کردی ہیں، اور اہل علم ان کے درجۂ صحت سے واقف ہیں۔

بعض نمایاں خصوصیات

(۱) یہ کتاب علم وثائق (Diplomatics) میں گرانقدر اضافہ ہے جس میں تاریخی دستاویزات کی جمع وترتیب اور ان کا تجزیاتی مطالعہ کیا جاتا ہے، عہد رسالت یا ابتدائی مسلم عہد حکمرانی کی دستاویزات سے متعلق اس کتاب سے پہلے اور بھی کتابیں آئی ہیں، جیسا کہ خود اس کتاب کے مراجع سے بھی ظاہر ہے، اور بعد میں بھی کافی کام ہوا، لائبریری سائنس کے ماہر ڈاکٹر محمد ماہر حمادہ اس موضوع پر استناد کا درجہ رکھتے ہیں، انھوں نے ''الوثائق السیاسیۃ والاداریۃ'' کے عنوان اس موضوع پر ٦ یا ٧ کتابیں لکھی ہیں، سے عہد اموی، عباسی، مملوک سلطنت، فاطمی اور ایوبی دور، دور اُندلس وشمالی افریقہ کی سیاسی دستاویزات کا احاطہ کیا ہے، اور دور حکومت کی مناسبت سے اس نام کے ساتھ ایک لاحقہ لگایا ہے جیسے عصر اموی کے لئے ''الوثائق السیاسیۃ والاداریۃ العائدۃ للعصر الاموی'' اور عہد عباسی کے لئے ''الوثائق السیاسیۃ والاداریۃ العائدۃ للعصر العباسی'' وغیرہ، اور یہ کتابیں مؤسسۃ الرسالہ، بیروت سے شائع ہوئی ہیں۔

اسی طرح قاضی اور مؤرخ شیخ محمد بن علی اکوع حوالی (۱۳۲۱-۱۴۱۹ھ) نے ''الوثائق السیاسیۃ الیمنیۃ من قبیل الاسلام الی ۳۳۲ھ'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، جس میں حضور اکرم ﷺ کے ۱۸۰ خطوط جمع کئے ہیں

جوآپ نے یمن کے حکمرانوں اورقبائلی سرداروں کے نام تحریر فرمائے ہیں، ان کے علاوہ خلافت راشدہ، عہد اموی اورعہد عباسی اور ماقبل اسلام کے بھی سینکڑوں دستاویزات اس میں شامل ہیں، جویمن کے حکمرانوں کومختلف حکومتوں کی جانب سے لکھے گئے، ۷۱۳ صفحات کی یہ ضخیم کتاب دارالحریۃ للطباعہ، بغداد سے ۱۹۷۶ء میں چھپی ہے، اور یہ کتاب بھی ڈاکٹر حمیداللہ صاحب کے مراجع میں شامل ہے؛ لیکن مراجع اوران کی زبانوں کی کثرت نیز دستاویزات کے تنوع کے اعتبار سے ڈاکٹر حمیداللہ صاحب کا کام سب پر حاوی ہے۔

(۲) اس کتاب میں زبان وبیان اوراُسلوب بھی ڈاکٹر صاحب کا بہت کچھ اپنا ایجاد کردہ ہے، عربی زبان عجمی اثرات سے محفوظ نہیں، اُردو زبان کے لئے وہ ''اللغۃ الہندوستانیۃ''، فرانسیسی زبان کے لئے ''اللغۃ الفرنساویۃ'' (ص:۷۳) اورانگریزی زبان کے لئے ''اللغۃ الافرنجیۃ'' (ص:۷۳) لکھتے ہیں، جب کہ بالترتیب ان کے لئے ''اللغۃ الاردیۃ''، ''اللغۃ الفرنسیۃ'' اور ''اللغۃ الانجلیزیۃ'' لکھا جاتا ہے، عیسوی کے لئے ''میلادیۃ'' لکھا جاتا ہے، ڈاکٹر صاحب ''مسیحیۃ'' لکھتے ہیں۔

(۳) ایسی اہم کتاب کی تالیف اوراس کے لئے بے نظیر قربانیوں اور جانفشانیوں کے باوجود ڈاکٹر صاحب کے انداز میں کہیں تعلّی یادعوی کا شائبہ نہیں ملتا، اس کے برعکس ہر ایڈیشن میں سابقہ غلطیوں کا اعتراف، اورارباب فکرونظر سے اغلاط کی تصحیح کی درخواست کرتے ہیں، مثلاانھوں نے کوہ سلع مدینہ منورہ سے غزوۂ خندق کے زمانہ میں حضرت علیؓ کے دست مبارک کی کندہ کی ہوئی ایک تحریر کا فوٹونقل کیا تھا (ص:۳۲) اوردستاویز نمبر: ۳۰۳ میں کوہ سلع سے ہی حضرت عمرؓ کے خط خاص میں لکھا ہوا ان کے نام کا فوٹونقل کیا ہے جس کی بیان کردہ سابقہ تفصیلات کی صحت سے تیسرے ایڈیشن کے حاشیہ میں معذرت کا اظہار کیا ہے۔ (ص:۳۵)

(۴) اورکتاب کی تالیف میں جن لوگوں سے بھی مدد ملی ہے اس کا کھلے دل سے اعتراف اوراحسان شناسی کا اظہار کیا ہے، جیسے ڈاکٹر محمد مصطفی اعظمی کی کتاب ''کُتّاب النبی ﷺ'' سے استفادہ کی صراحت اورمصنف کا خصوصی شکریہ ادا کرتے ہیں، ترکی محقق جناب احسان ثریا صیرما کا بھی خوب شکریہ ادا کرتے ہیں، صرف ایک خط پر روسی مصنف علی کولیسنیکوف کے بھی شکرگذار ہوتے ہیں۔ (ص:۱۱)

اس کتاب کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی، اسلامی سیاست وحکومت اوراسلام کے بین الاقوامی تعلقات وغیرہ پر جتنی تحقیقی کتابیں عالم عرب یا یورپ وغیرہ میں لکھی جارہی ہیں ان میں اس کا حوالہ ناگزیر سمجھا جاتا ہے، یہ اس کے عنداللہ اورعندالناس مقبولیت کی ایک واضح دلیل ہے۔

• • •

ڈاکٹر فواد سیزگین—علوم اسلامی کا شناور

مولانا عبید اختر رحمانی ☆

تمہید

ترکی کا ماضی نہایت روشن، ماضی قریب تھوڑا دھندلا؛ لیکن حال تابناک اور مستقبل درخشاں ہے، ترکی نے سیاسی محاذ پر اسلام کی جو خدمات انجام دی ہیں، وہ محتاج تعارف نہیں، یہی وجہ ہے کہ آج بھی یوروپ کو ترکی سے ڈر لگتا ہے اور سلطنت عثمانیہ کا ذکر ڈرے سہمے لہجوں میں ہوتا ہے، ترکی سیاسی میدان سے ہٹ کر علوم اسلامی میں بھی اپنی گراں قدر شراکت کی وجہ سے قابل فخر ہے، یہاں کی خاک سے اُٹھنے والے علماء فقہاء اور دیگر فنون کے ماہرین نے علوم اسلامیہ میں جو بیش قیمت اضافہ کیا ہے وہ نہایت گراں قدر ہے، ان ہی ماہرین کی کڑی میں ایک اہم شخصیت ڈاکٹر فواد سیزگین کی ہے۔

مختصر سوانح

آپ ۲۴؍ربیع الاول ۱۳۴۲ھ، مطابق ۲۴؍اکتوبر ۱۹۲۴ء کو مشرقی ترکی کے شہر بتلس (Bitlis) میں پیدا ہوئے، ۱۹۵۰ء میں استنبول یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا، مشہور مستشرق ہیلموٹ ریٹر آپ کے دکتوراہ کے مقالہ کے نگراں تھے، آپ کے مقالے کا موضوع تھا: ''صحیح بخاری کے مصادر'' ۱۹۵۴ء میں آپ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی اور اسی یونیورسٹی میں آپ استاذ مقرر ہو گئے، بعد میں آپ کا یہی مقالہ ''دراسات حول مصادر البخاری'' کے نام سے ۱۹۵۶ء میں طبع ہوا، ۱۹۶۰ء میں ترکی میں فوج نے حکومت پر قبضہ کیا اور فوجی حکومت نے ۱۴۶ پروفیسر حضرات کو برطرف کر دیا، برطرف کئے جانے والوں میں سے ایک فواد سیزگین بھی تھے، برطرفی کے بعد آپ ۱۹۶۱ء میں جرمنی منتقل ہو گئے اور ۱۹۶۵ء میں فرانکفرٹ یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہو گئے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ فرانکفرٹ کو آپ نے اپنے علمی و تحقیقی کاموں کا مرکز بنایا اور یہیں آپ نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ صرف کیا اور یہیں آپ نے علوم اسلامیہ کے دشت کی سیاحی کی اور اس فن میں آپ کی بیش قیمت اور گرانقدر تالیفات منظر عام پر آئیں۔

☆ نگراں شعبۂ تحقیق: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

ڈاکٹر صاحب کے اساتذہ

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے پی ایچ ڈی مقالہ کے نگراں مشہور مستشرق ہیلموٹ ریٹر تھے، ریٹر سے ملاقات آپ کی زندگی میں انقلاب کی حیثیت رکھتی ہے، خود آپ کا اعتراف ہے کہ: ''ریٹر سے ملنے کے بعد ایسا لگا جیسے میں دوبارہ پیدا ہوا ہوں'' اس کے علاوہ آپ مشہور مستشرق کارل بروکلمان جن کی ''تاریخ الادب العربی'' بہت مشہور ہے، کے بھی شاگرد رہے ہیں، یہ دلچسپ اتفاق ہے کہ کارل بروکلمان آپ کے بھی استاذ ہیں اور آپ کے استاذ ریٹر کے بھی استاذ ہیں۔

تصنیفات وتالیفات

جیسا کہ ماقبل میں مذکور ہوا کہ آپ کی پہلی تصنیف جو منظر عام پر آئی ہے، وہ آپ کے پی ایچ ڈی کا مقالہ ''دراسات حول مصادر البخاری'' ہے؛ چوں کہ مشہور جرمن مستشرق کارل بروکلمان بھی آپ کے استاذ رہے ہیں، آپ نے ان کے ہی کام کو نیا رنگ وآہنگ بخشا اور پندرہ سال کی مشقت کے بعد تیرہ جلدوں میں ''تاریخ التراث العربی'' وجود میں آئی، یہ کتاب اصلاً جرمن زبان میں ہے، اس کتاب کا عربی میں ترجمہ دکتور محمود فہمی حجازی نے کیا ہے اور اس پر نظر ثانی دکتور عرفہ مصطفیٰ اور دکتور سعید عبدالرحیم نے کی ہے، اس کتاب میں اسلامی علوم وفنون، جیسے قرآن، حدیث، تاریخ، فقہ، عقائد، تصوف، شاعری، لغت، نحو، بلاغت، عروض، ادب، فلسفہ، منطق، علم النفس، علم الحیوان، اخلاقیات، سیاسیات، سماجیات، طب، کیمیا، علم نباتات، زراعت، فلکیات، احکام النجوم، علم الاجتماع، جغرافیہ، طبیعیات، ارضیات اور موسیقی وغیرہ کا تعارف اور اس فن میں لکھی گئی کتابوں کی نشاندہی ہے، یہ بھی بتایا ہے کہ کتاب کتنی مرتبہ اور کہاں کہاں سے طبع ہوئی ہے اور اگر مخطوط ہے تو اس کے مخطوطے دنیا کے کن کن کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ اسلامی علوم وفنون پر ایک انسائیکلو پیڈیا اور موسوعہ ہے، اپنی اس کتاب کے بارے میں دکتور فواد لکھتے ہیں کہ یہ کتاب اولاً بروکلمان کی تاریخ الادب العربی کے ذیل کے طور پر لکھی گئی تھی؛ لیکن بعد میں احساس ہوا کہ یہ کتاب کارل بروکلمان کی کتاب سے زیادہ مفید ہے؛ لہٰذا میں نے اسے مستقل کتاب کی حیثیت سے شائع کیا۔(۱)

اس کتاب پر استدراک بھی لکھا گیا ہے، کتاب کا نام ہے ''استدراکات علی تاریخ التراث العربی'' اس کتاب کے مؤلف دکتور حکمت بشیر یاسین ہیں، اور اس پر مقدمہ لکھا ہے دکتور بکر بن عبداللہ ابوزید نے، اس کتاب کے مقدمہ میں دکتور حکمت بشیر لکھتے ہیں :

---

(۱) دیکھئے: مقدمہ تاریخ التراث العربی۔

ومن هولاء أ-د- فواد سزكين مؤلف كتاب ''تاريخ التراث العربي'' الذى أودع فيه درراً من نفائس تراث القرون الأربعة الأولىٰ وأوائل القرن الخامس من الموجود والمفقود ، فنظمها فى هذا الكتاب فأجاد وأفاد فى ذكر المخطوطات ولكن فاته الشى الكثير من آلاف الكتب والنسخ ۔ (۱)

اور ان ہی مخطوطات کی خاک چھاننے میں اپنی عمر گزار دینے والوں میں سے ایک دکتور فواد سزگین ہیں، جو''تاریخ التراث العربی'' کے مؤلف ہیں، اس میں انھوں نے پہلے چار اسلامی صدیوں اور پانچویں صدی کے بیش قیمت اسلامی علمی ورثہ کا خواہ وہ مخطوط ہو یا مطبوع، ذکر کیا ہے، اور اس کتاب میں اس کو بہترین سلیقے اور طریقے سے بیان کیا ہے؛ لیکن ان سے ہزاروں کتابوں اور نسخوں کا بیان باقی رہ گیا ہے۔

آپ کی تیسری کتاب ''اسلام کے قدرتی علوم'' ہیں، یہ پانچ جلدوں میں ہیں، جس میں آپ نے سائنس کی مختلف شاخوں میں مسلمانوں اور عربوں کے کارناموں کا تفصیلی ذکر کیا ہے، اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر محمود غازی جن کا شمار پاکستان کے نامور اہل علم میں ہوتا ہے، فرمایا کرتے تھے: ''اس کتاب کے براہ راست مطالعہ کے لئے اگر جرمن زبان بھی سیکھنی پڑے تو سیکھنی چاہئے'' اس کتاب کی تالیف کا قصہ یہ ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ اپنے استاد ہیلموٹ ریٹر سے پوچھا کہ کیا ریاضی کے میدان میں کوئی بڑا مسلم ریاضی داں گزرا ہے؟ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں میں کوئی بڑا ریاضی داں نہیں گزرا ہے؛ لیکن ان کے استاذ نے متعدد مسلم ریاضی دانوں کا ذکر کیا، اس سے ان کی آنکھ کھلی اور آپ نے اس شعبہ کو تحقیق کے لئے منتخب کرلیا اور برسوں کی محنت کے بعد یہ کتاب لکھی۔

اس کتاب میں اس بات کو مدلل طور پر ثابت کیا کہ یوروپ جسے ''قرون مظلمہ''، ''ڈارک ایج'' یا ''تاریک عہد'' کہتا ہے وہ مسلمانوں کے حق میں قطعاً غلط ہے، اگر یوروپ میں اس وقت ترقی نہیں ہو رہی تھی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ پوری دنیا ہی غیر ترقی یافتہ تھی، جیسے آج اگر یوروپ میں علوم وفنون کا عروج ہے؛ لیکن دنیا کے کئی خطے اب بھی ٹکنالوجی کی برکات سے محروم ہیں تو اس بناء پر جیسے ٹکنالوجی سے محروم خطہ کا اس عہد کو تاریک دور کہنا صحیح نہیں، ویسے ہی یوروپ کا اس عہد کو اپنی محرومی کی بناء پر تاریک عہد کہنا درست نہیں۔

(۱) مقدمہ: استدراکات علی التاریخ التراث العربی۔

ڈاکٹر فواد سزگین علمی شخصیت تھے، ان کے علمی خطبات کا مجموعہ ''محاضرات فی تاریخ العلوم العربیہ والاسلامیہ'' کے نام سے عربی میں شائع ہوا ہے، اس کتاب کا اُردو ترجمہ ڈاکٹر خورشید رضوی نے کیا ہے اور اُردو میں یہ کتاب ''تاریخ علوم میں تہذیب اسلامی کا مقام'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے کئی بیش قیمت نکات کی جانب توجہ دلائی ہے، جیسے یہ کہ سائنس پر یونانیوں کی اجارہ داری نہیں، ان سے ڈھائی ہزار سال قبل بھی سائنسی علوم وفنون کا وجود تھا اور اسی طرح سائنسی علوم وفنون کی تاریخ میں یونان کے بعد سیدھے یوروپ کا ذکر کرنا علمی خیانت ہے، یونان سے پہلے جن قوموں نے سائنسی علوم وفنون کو پروان چڑھایا اور یونانیوں کے بعد عربوں اور مسلمانوں نے جس طرح سائنس کو نیا مقام بخشا، اس کا اعتراف ضروری ہے۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے یہ نکتہ بھی اپنے خطبات میں بیان کیا ہے کہ مسلم سائنس دانوں کے کارناموں کا سرقہ کیا گیا ہے اور مسلم سائنس دانوں کے کارناموں کو مغربیوں سے منسوب کردیا گیا ہے اور یہ محض غلطی سے اور بے خیالی میں نہیں ہوا؛ بلکہ جان بوجھ کر ایسا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب مغرب نے سائنسی علوم کے لئے مسلمانوں کی جانب ہاتھ پھیلایا تو وہاں مسلمانوں سے سخت تعصب اور عناد تھا جب کہ مسلمانوں نے یونانی علوم وفنون سے جس وقت اکتساب کیا تھا، اس وقت بیشتر یونانی مفتوحین اسلام کے حلقہ بگوش ہو چکے تھے؛ لہٰذا تعصب اور عناد کا یہاں کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے اس امر کی جانب بھی توجہ دلائی ہے کہ محض مغرب کے سازش وعناد کا ذکر کرنا کافی نہیں ہے؛ بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان خود اپنے علمی ورثہ کی کھوج کریں، تلاش وتحقیق کریں اور دیکھیں کہ ان کے اسلاف کارنامے کیا ہیں، ان کی علمی فتوحات کیا ہیں اور کہیں ان کے اسلاف کی علمی فتوحات اور تحقیقات کسی دوسرے سے منسوب تو نہیں کردی گئی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے خطبات میں اس امر کی جانب بھی توجہ دلائی ہے کہ نہ محض ماضی پرستی مفید ہے اور نہ ماضی سے کنارہ کش ہوکر مغربی تہذیب کو اپنا لینا فائدہ مند ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اعتدال اختیار کرتے ہوئے مغرب کی اچھی باتوں کو قبول کیا جائے اور مغرب کی غلط باتوں پر نقد کیا جائے اور اس کا غلط ہونا واضح کیا جائے۔

ادارہ تاریخ علوم عربیہ واسلامیہ کا قیام

عموماً علمی شخصیات تحریکی نہیں ہوتی ہیں، ان کے اندر علمی تحقیق سے ہٹ کر کسی دوسرے معاملے میں تھوڑی کسل مندی ہوتی ہے، ڈاکٹر صاحب علمی شخصیت کے ساتھ دیگر اُمور میں بھی فعال اور متحرک تھے،

یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ۱۹۸۲۱ء میں فرانکفرٹ یونیورسٹی کے قریب ''ادارہ تاریخ علوم عربیہ واسلامیہ'' (Institute of the History of the Arab Islamic Science) قائم کیا، جہاں اس وقت پوری دنیا میں اسلامی علوم کی تاریخ کے موضوع پر سب سے زیادہ کتابیں موجود ہیں، ۱۹۸۳ء میں اسی ادارے کے تحت میوزیم قائم کیا،جس میں اسلامی عہد کے آلات،اوزاراورنقشوں کے ۸۰۰ سے زائدنقول فراہم کئے،ڈاکٹر صاحب نے اس ادارہ کے قیام کے لئے دنیا بھر کا سفر کیااور دنیا بھر کی مملکتوں اور تنظیموں سے اس کے لئے مالی امداد حاصل کیا، بالخصوص خلیجی مما لک نے ڈاکٹر فواد سزگین کے اس منصوبے پر دل کھول کر مدد کی ،کویت نے اس منصوبہ کے لئے سب سے زیادہ مالی امداد فراہم کیا۔

زبان

ترکی ڈاکٹر صاحب کی مادری زبان ہے،عربی زبان انھوں نے ترکی میں اسلامی علوم کے مطالعہ کی خاطر سیکھا تھا، جرمن زبان انھوں نے جرمنی میں قیام کے دوران سیکھا اوران کی بیشتر تصنیفات بھی جرمن زبان میں ہی ہیں، انگریزی زبان سے ڈاکٹر صاحب کواچھی واقفیت تھی اور روانی سے انگریزی میں گفتگو کرنے پر قادر تھے، ان کےعلاوہ بھی وہ دنیا کی کئی دیگر زبانوں سے واقف تھے۔

اعزازات

دکتور فواد سزگین کے علمی وتحقیقی کاموں کی پوری دنیا میں پذیرائی ہوئی اور دنیا بھر کے علمی وتحقیقی اداروں جیسے ٹرکش اکیڈمی آف سائنسز، اکیڈمی آف دی کنگڈم آف مراکو، اور قاہرہ ، دمشق اور بغداد کے متعدد علمی وتحقیقی اداروں نے ان کی رکنیت کواپنے لئے باعث شرف سمجھا، انھیں مختلف حکومتوں اورملکوں نے بھی گراں قدر اعزاز سے نوازا، ۱۹۷۹ء میں سعودی عرب نے ان کوشاہ فیصل ایوارڈ عطا کیا اور بعد ازاں جرمنی کی حکومت نے انھیں آرڈر آف میرٹ آف فیڈرل ری پبلک آف جرمنی اور گولڈ میڈل سے بھی نوازا۔

ڈاکٹر صاحب کا علمی انہماک

ڈاکٹر فواد سزگین کوان کے استاذ ہیلموٹ ریٹر نے ابتدا میں ہی یہ نصیحت کی تھی کہ: ''اگر تم اسکالر بننا چاہتے ہواوراہل علم میں اپنا شمار کرنا چاہتے ہیں تو سولہ سترہ گھنٹے مطالعہ کواپنا معمول بنالو'' ڈاکٹر صاحب نے اس نصیحت کوحرز جان بنالیااوران کا عمر کے آخری پڑاؤ میں بھی یہی حال تھا کہ اُٹھارہ اُٹھارہ گھنٹے مطالعہ کرتے تھےاور گھر والوں سے ملاقات محض دسترخوان پر کھانے کے وقت ہی ہوتی تھی۔

وقت کی پابندی

دنیا کے ہر بڑے انسان جس نے تاریخ میں کچھ نام کمایا ہے یا دنیا کو کچھ دیا ہے، ان تمام حضرات کی زندگی میں یہ بنیادی صفت مشترک رہی ہے کہ انھوں نے وقت کی پابندی کی ہے اور وقت کا صحیح استعمال کیا ہے، ڈاکٹر فواد سیزگین بھی وقت کے بہت پابند تھے اور ہر کام اپنے مقررہ وقت پر کرتے تھے۔

ذاتی کتب خانہ

ڈاکٹر صاحب کو کتابوں کا شوق نہیں؛ بلکہ جنون تھا، اسی جنون کی وجہ سے وہ دنیا بھر کے کتب خانے چھان کر کتابیں اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو سکے، ان کے کتب خانہ کے معیار اور مقدار کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ جرمنی کی حکومت نے ان کے کتب خانہ کو قومیا لیا تھا اور ان کو اس کتب خانہ کی کتابیں جرمنی سے باہر لے جانے پر پابندی عائد کر دی، ہاں اس کے بدلے میں جرمنی حکومت نے انھیں خاطر خواہ معاوضہ بھی ادا کیا، اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مغرب کی حکومتیں علمی ذرائع و وسائل کے حصول کی کتنی متمنی رہتی ہیں، جب کہ مشرقی حکومتوں کے بارے میں آج تک یہ نہیں سننے میں آیا کہ کسی حکومت نے کسی پرائیویٹ کتب خانے کو قومیایا ہو، اس مثال سے مشرق و مغرب کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے، ڈاکٹر صاحب نے ترکی منتقل ہونے کے بعد وہاں بھی اپنا کتب خانہ بنایا تھا، ان کے انتقال کے بعد ترکی حکومت ان کی لائبریری کے لئے مستقل عمارت تعمیر کر رہی ہے۔

انتقاد

انسان کی خوبی میں نسیان کا عیب بھی شامل ہے، اہل علم چاہے ماضی کے ہوں یا حال کے، ان کی بعض آراء وافکار تنقید سے نہیں بچ سکی ہیں، ڈاکٹر صاحب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں، امام بخاریؒ پر آپ نے جو دکتوراہ کا مقالہ لکھا اور پھر بعد میں اسی کو حذف و اضافہ کے ساتھ کتابی شکل میں پیش کیا، اس کے علاوہ تاریخ التراث العربی میں بھی امام بخاریؒ پر آپ نے اپنے دکتوراہ والے موقف کا اعادہ کیا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی ان تصانیف میں امام بخاریؒ پر تنقید کی ہے اور لکھا ہے کہ وہ اسناد کے ماہر عالم نہیں تھے، یہی وجہ ہے کہ بخاری میں بہت سی روایات بلا اسناد ملتی ہیں جو امام بخاریؒ کی اپنی کتاب کے نام ''الجامع الصحیح المسند'' کے مغائر ہے، اس کے علاوہ وہ اس کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ امام بخاریؒ کے اس طرز عمل سے اسناد کی اہمیت کم ہوئی اور بعد کے ادوار میں اس طرز عمل کو مقبولیت ملنے سے اسناد کی اہمیت کم تر ہوتی چلی گئی، ڈاکٹر صاحب کے اس موقف پر متعدد اہل علم نے مدلل رد لکھا ہے، یہاں تفصیل بیان کرنے کی حاجت نہیں، باذوق اور اہل علم قارئین بھی ڈاکٹر صاحب کے موقف کی کمزوری سے بخوبی واقف ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب پر دوسری تنقید یہ ہے کہ وہ مستشرقین سے بہت متاثر ہیں، اوران کی وہ آراء جو اسلامی عقائد ومسلمات سے مغائر ہیں، وہ جوش عقیدت میں ان کو بھی قبول کرتے چلے جاتے ہیں، ڈاکٹر صاحب کی اسی علمی کمزوری کی جانب دکتور حکمت بشیر یاسین اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

وقع فی أخطاء جسیمة بسبب کثرة نقوله عن بعض المستشرقین الحاقدین ، ویبدو أنه تأثر منذ شبابه بمعاهد الاستشراق ومن خلال تصریحاته فی المقابلة التی أجرتها مجلة الفیصل اخبرنا عن نشأته بعد أن أنهی الدراسة الثانویة اتجه الی کلیة الهندسة ومالبث فیها أن ترکها فاتجه الی (معهد الشرقیات بمدینة اسلامبول) الذی قام به المستشرق (هلمونت ریتر عام 1933م) ۔ (۱)

اسلام سے کینہ رکھنے والے مستشرقین سے بکثرت نقل کرنے کی وجہ سے ڈاکٹر فواد سیزگین بڑی غلطیوں کے شکار ہوئے ہیں، اور بظاہر ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنی نوجوانی میں استشراقی اداروں سے متاثر ہوئے اور جیسا کہ انھوں نے خود مجلہ فیصل کو انٹرویو دیتے ہوئے اعتراف کیا کہ وہ سکنڈری کی تعلیم کے بعد انجینئرنگ کالج میں داخل ہوئے ؛ لیکن اس کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر اسلامبول (استانبول) میں قائم ادارہ شرقیات میں داخل ہوئے، جس کو مشہور مستشرق ہیلموٹ ریٹر نے 1933ء میں قائم کیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے مجلہ فیصل کے نمائندے کے ایک سوال کے جواب میں کہا :

ولا أکتمک أننی کنت الطالب الوحید فی الفصل لمدة ثلاث سنوات استطعت خلالها أن أوطد صداقتی بأستاذی (هلمونت ریتر) الذی کان لتوجیهاته أثر فعال فی مجری حیاتی العملیة والعلمیة ۔(۲)

میں آپ سے یہ بات نہیں چھپاؤں گا کہ تین سال تک میں ہیلموٹ ریٹر کا اکیلا شاگرد تھا اور اس درمیان میری قربت سے ان سے بہت زیادہ ہوئی اور ہیلموٹ ریٹر کا میری علمی وعملی زندگی پر بہت زیادہ اثر ہے۔

(۱) مقدمہ: استدراکات علی تاریخ التراث العربی۔ (۲) مقدمہ: استدراکات علی تاریخ التراث العربی۔

وفات حسرت آیات

۹۴؍سال کی بھرپور علمی وعملی زندگی گزارنے کے بعد ۱۶؍شوال ۱۴۳۹ھ مطابق 30؍جون 2018ء کو استانبول میں آخری سانس لی اور خالق حقیقی سے جاملے، آپ کے انتقال کی خبر لمحوں میں پوری دنیا میں پھیل گئی اور علمی حلقوں میں غم کی لہر دوڑ گئی، دنیا بھر کے اہل علم نے ان کی وفات کو علمی حلقوں کے لئے ایک خسارہ بتایا۔

آپ کی نماز جنازہ مسجد فاتح استانبول میں ادا کی گئی، ترکی کے صدر رجب طیب اُردگان، وزیر اعظم بن علی یلدرم، سابق وزیر اعظم داؤد اوگلو اور دیگر زعماء نے آپ کے جنازہ میں نہ صرف شرکت کی ؛ بلکہ قبرستان تک مشایعت بھی کی، رجب طیب اُردگان نے اس موقع سے یہ بھی اعلان کیا ترکی حکومت آئندہ سال 2019ء کو فواد سیزگین کے سال کے طور پر منائے گی اور پورے سال ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر کانفرنس اور سیمینار وغیرہ منعقد کئے جائیں گے۔

• • •

فتاویٰ

مفتی اشرف علی قاسمی ☆

طلاق مغلظہ کے بعد بیوی کو ساتھ میں رکھنا؟

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء عظام ومفتیان کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں، میری شادی نو سال قبل ہوئی تھی ، شادی کے ٹھیک چار ماہ بعد میاں بیوی میں اختلاف ہونے لگا، میرے گھر پر جب تک رہتی بالکل ٹھیک رہتی اور جب اپنے میکہ جاتی تو وہاں کبھی ایک سال دو سال حتی کہ ڈھائی سال تک رہتی ، ایسا پانچ یا چھ مرتبہ ہوا صلح وصفائی کی بہت کوشش کی ؛ مگر کسی بھی طرح بات نہیں بنی ، میری بیوی اپنے باپ کی اکلوتی بیٹی ہے اور زبان دراز بہت زیادہ ہے اور میرے سسر اپنی بیٹی کو سمجھانے کے بجائے اپنی بیٹی کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں ، بالآخر میں نے ہر طرف سے پریشان ہوکر آج سے چندہ ماہ قبل فون کے ذریعہ سے اپنی بیوی کو تین طلاق مغلظہ دے دیا ، پھر سپریم کورٹ کے ذریعہ تین طلاق کا مسئلہ اُٹھا، اس لئے میں نے یہ بات ظاہر نہیں کی ، طلاق دینے سے پہلے اور بعد میں بھی کئی مرتبہ میں نے اپنے سسر کو کہا کہ میں نہیں رکھوں گا ، میں کسی بھی قیمت پر فیصلہ چاہتا ہوں ،تو سسر صاحب ۲ / لاکھ روپیہ کی مانگ کرتے اور کہتے یا تو دو لاکھ روپیہ دو ورنہ اسی سے نباہ کرو، طلاق کے بعد بھی وہ میرے ساتھ تین ماہ تک رہی تھی ، وہ میرے قریب آنے کی کوشش کرتی ؛ لیکن میں جھوٹ بول کر اور گناہ سے بچنے کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ کرتا ، جب معاملہ روز بروز بگڑتا گیا تو پھر میں نے اس سے کہا کہ میں تجھے آج سے چندہ ماہ قبل طلاق مغلظہ دے چکا ہوں اور میرے ساتھ لانے کی وجہ یہی ہے کہ میں اسے اکیلی میں کہہ کر،

☆ معتمد اُمور انتظامی: المعہد العالی الاسلامی حیدر آباد۔

حلالہ کرواکے دوبارہ نکاح کرلوں گا، جب یہ بات میں کہنے کی ہمت کرتا تو لڑائیاں، گالی گلوچ نکالنی شروع کردیتی، پھر میں نے چند مخصوص آدمیوں کو جمع کرکے کہہ دیا، تو کیا اس صورت میں طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ نیز میں ایک امام ہوں، تو کیا اس صورت میں میرے لئے امامت کرنا درست ہے یا نہیں؟ جب طلاق کی بات عام ہوئی تو لوگوں نے اس کے باپ کو بلاکر کہہ دیا کہ اپنی بیٹی کو اپنے ساتھ لے جاؤ، تو سسر صاحب بولنے لگے کہ کچھ بھی ہوجائے، چاہے میری بیٹی مرجائے، یا پھر باہر نکال دے میں کسی بھی قیمت پر ساتھ نہیں لے کر جاؤں گا، تو اس صورت میں میرے لئے امامت کرنا درست ہے یا نہیں؟ نیز کچھ آدمی مجھے امامت سے ہٹانا چاہتے ہیں، ان کا یہ فعل کیسا ہے اور کہاں تک درست ہے؟ آپ سے درخواست ہے کہ اس مسئلہ کا قرآن وحدیث کی روشنی میں مدلل جواب عنایت فرمائیں۔ (محمد عمران، رتن گڑھ)

جواب:- امامت کا منصب بہت اونچا منصب ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **"الامام ضامن"** (ترمذی، حدیث نمبر: ۲۰۷، باب ماجاء، ان الامام ضامن والمذن مؤتمن) کہ امام کی نماز مقتدیوں کی نماز کو شامل ہے، اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ امام ایسے شخص کو ہونا چاہئے جو گناہوں سے بچتا ہو، لوگوں میں اس کی عزت وعظمت ہو، صاف ستھری شبیہ ہو، اس کی زندگی ایسی ہو کہ لوگ اس کو متہم نہ کریں اور اس پر انگلیاں نہ اُٹھائیں، ہندیہ میں ہے: **"ولم يطعن في دينه كذا في الكفاية ...... ويحتسب الفواحش الظاهرة"**۔ (ہندیہ: ۱/۴۳)

سوال میں جس بات کا ذکر کیا گیا ہے، اس میں مذکور ہے کہ امام صاحب نے بیوی کو تین مغلظہ طلاق بھی دیا اور اپنی عزت بچانے کی خاطر لوگوں سے اس کا تذکرہ بھی نہیں کیا، گو زن وشوہر کے تعلقات قائم نہیں ہوئے؛ لیکن ایک عرصہ دراز تک طلاق کے باوجود بیوی کو اپنے ساتھ رکھنا ایک فاسقانہ عمل ہے اور فاسق کی امامت مکروہ ہے، تاہم مکروہ ہونے کے باوجود مقتدی کی نماز بہر حال ادا ہوجاتی ہے؛ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حجاج بن یوسف کی اقتداء میں بھی نماز ادا کی ہے؛ حالاں کہ فقہاء نے اس کو **"فاسق اهل زمانة"** قرار دیا ہے۔ (مجمع الانہر: ۱/۱۰۸)

جہاں تک ایسے امام کی خدمت سے علاحدگی کی بات ہے، اگر ذمہ داران علاحدہ کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں؛ البتہ اس کا خیال رہے کہ اس سے فتنہ وانتشار نہ ہو اور اجتماعیت کو نقصان نہ پہنچے، واللہ اعلم بالصواب۔

رمضان کی طاق راتوں میں اجتماعی عبادت ودُعا

سوال:- کیا فرماتے ہیں مفتیانِ شرع متین مسئلہ ہذا کے بارے میں کہ ہمارے شہر

ناندیڑ (مہاراشٹرا) میں اکثر و بیشتر مساجد میں رمضان المبارک کے مہینہ میں یہ معمول ہے کہ جب رمضان المبارک کی طاق راتیں ہوتی ہیں تو اس میں اجتماعی عبادت ودُعاء کانظم ہوتا ہے، اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ تراویح کے ختم ہونے کے بعد ۱۱/ ۱۲ بجے کسی عالم کا بیان ہوتا ہے اور ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے بیان کے بعد دُعا ہوتی ہے، اس کے بعد لوگ اپنے مکانات پر چلے جاتے ہیں اور کچھ لوگ مسجد ہی میں عبادت وغیرہ میں یا سونے میں مشغول ہوجاتے ہیں اور پھر بعض مساجد میں بیان وغیرہ کے بعد سحری کا بھی نظم رہتا ہے اوران بیانات کے دیگر مساجد میں اعلانات بھی ہوتے ہیں اور اکثر و بیشتر اشتہارات بھی چھپتے ہیں کہ فلاں مسجد میں اس طاق رات کو فلاں عالم صاحب کا بیان ہوگا اور اس طرح جب رمضان المبارک کی آخری رات (لیلۃ الجائزہ) ہوتی ہے تو اس میں بھی اکثر مساجد میں اجتماعی دُعا کا اہتمام ہوتا ہے، تو کیا اس طرح رمضان المبارک کی مقدس راتوں میں اور اسی طرح طاق راتوں میں لیلۃ الجائزہ میں اجتماعی عبادت و اجتماعی دُعا کا نظم جائز ہے؟ اُمید ہے کہ مدلل ومفصل جواب دے کر ممنون ومشکور فرمائیں گے۔ (محمد احمد خان قاسمی، ناندیڑ)

جواب:- رمضان المبارک نیکیوں کا موسم بہار ہے، جہاں تک ہوسکے نیکیاں جمع کرنے کا جو موقع ملے اس کو غنیمت سمجھ کر بجالانا چاہئے اور موقع نہیں گنوانا چاہئے؛ لیکن طریقہ وہی ہو جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہو اور صحابہ کرام کا معمول رہا ہو، اس سے ہٹ کر کوئی بھی عمل قابل اعتبار نہیں ہے، شرعاً اس کا اعتبار نہیں ہے، نفل کی جماعت کے جس اہتمام کا تذکرہ سوال میں موجود ہے، صحابہ وتابعین سے ثابت نہیں، نفل میں اصل یہ ہے کہ گھر میں ادا کی جائے اور تنہا ادا کیا جائے، جس کا مقصد یہ ہے کہ ریا اور دِکھاوا نہ ہو اور اللہ سے براہ راست بندہ مناجات کرے، آپ ﷺ کا معمول مبارک بھی نوافل کو گھر میں ادا کرنے کا رہا ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا: ’’اے لوگو! گھر میں نمازیں پڑھو؛ کیوں کہ فرض نمازوں کے علاوہ دوسری نمازوں میں افضل نماز وہ ہے جو گھر میں پڑھی جائے‘‘ اس لئے آپ نے قیام اللیل کی جو صورت ذکر کی ہے کہ باضابطہ اہتمام اور اعلان ہوتا ہے، اخباروں میں اشتہارات آتے ہیں، وہ تداعی کے ساتھ نفل کی نماز ہے، جس کو فقہاء نے مکروہ لکھا ہے، (اعلاء السنن: ۷/ ۸۹-۹۰) تداعی یہ ہے کہ ایک دوسرے کو بلایا جائے، یہاں تو باضابطہ اخبارات میں اعلانات ہوتے ہیں، ہینڈ بل تقسیم کیا جاتا ہے، مائک پر بہ آواز بلند لوگوں کو تہجد باجماعت میں شرکت کے لئے بلایا جاتا ہے، علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں: ’’یکرہ ذلک لو علی سبیل التداعی بأن یقتدی أربعة بواحد کما فی الدرر‘‘۔ (درمع الرد: ۲/ ۴۹)

اس لئے آپ نے جوصورت ذکر کی ہے اس میں نماز تو ہوجاتی ہے؛لیکن باضابطہ پروگرام بنانے اور بلانے اوراس کے تداعی ہونے کی وجہ سے مکروہ ہے،تداعی نہ ہو،کوئی اشتہار نہ ہواورلوگ جماعت میں خودبخود جڑتے چلے جائیں تواس میں کراہت ہے یانہیں؟اس میں اختلاف ہے،صحیح بات یہ ہے کہ گنجائش ہے؛البتہ جولوگ شریک نہ ہوں،انھیں دعوت نہ دی جائے اور جولوگ شریک نہ ہوں وہ شریک ہونے والوں کو نہ روکیں،اس سلسلہ میں شدت اختیارکرنا ناپسندیدہ عمل ہے،واللہ علم۔

بعض ضروری مسائل کی وضاحت

سوال:- درجہ ذیل سوالات کے سلسلہ میں حدیث،سیرت نبوی اور سیرت خلفاء راشدین اورقرآن کی روشنی میں فتویٰ حاصل کرنا چاہتا ہوں،جتنا ممکن ہوسکے حوالے جات ضرور تحریرفرمائیں،سوال بہ سوال جوابات دیئے جائیں تو احسن ہوگا :

(۱) اگرکوئی گروپ میلادالنبی ﷺ کی خوشی میں جلسہ منعقدکر کے اس میں حضور ﷺ کی سیرت و اخلاق کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانوں کو اچھے اخلاق کی طرف راغب کرتا ہے تو اسلام اس عمل کوکیا کہتا ہے؟

(۲) اگرکوئی گروپ یا شخص میلادالنبی ﷺ کی خوشی میں مٹھائی تقسیم کرے یا پھرلوگوں کوکھانا کھلائے،تو اسلامی نقطۂ نظر سے اس فعل کوکیا کہا جائے گا؟

(۳) انفرادی طور پرایک مسلمان اپنے نبی کی پیدائش کے سلسلہ میں اپنی محبت اورخوشی کا اظہارکس طرح کرے؟

(۴) ایسے مسلمان جو اسلام کے احکام پر پوری طرح کاربندنہیں ہیں،ان کو اپنے نبی کی پیدائش کے سلسلہ میں اپنی محبت اورخوشی کے اظہار کا حق ہے یانہیں؟

(۵) ایسے مسلمان جو دینی اور دنیاوی تعلیمات سے نابلد ہیں وہ اپنے نبی کی میلاد کی خوشی کس طرح منائیں؟

(۶) کیا دورِحاضر میں اسلام کے کچھ مسائل میں علماء اجتہاد کی ضرورت محسوس کرتے ہیں؟

(۷) ہمارے محلہ کی مسجد میں صبح فجر کی نماز کے بعد اور پھرعصر کی نماز کے بعد تفسیر قرآن اورحدیث پڑھی جاتی ہے،اس مجلس کے اختتام پرحاضرین مجلس ایک دوسرے مصافحہ کرتے ہیں اور پھراپنے اپنے گھروں کورُخصت ہوجاتے ہیں۔

(۸) جوصاحب فجر میں تفسیر پڑھتے ہیں،لوگوں سے مصافحہ کرتے ہیں،مگر وہی صاحب جب عصر میں حاضر رہتے ہیں تو امام مسجد کے حدیث پڑھنے کے بعد کسی سے مصافحہ نہیں کرتے ، جب کے دوسرے تمام حاضرین ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے ہیں ۔(سید لطیف الحسن ، یاقوت پورہ)

جواب:- آنحضرت ﷺ نے شرک کے بعد جس چیز کی سب سے زیادہ نکیر اور تردید فرمائی ہے وہ بدعت ہے، بدعت کہتے ہیں دین میں دین سمجھ کر کسی چیز کا ایجاد کرنا، دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں جو چیز رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ میں مروج نہ ہو؛ حالاں کہ اس کے اسباب اس وقت موجود تھے، پھر بھی اس کا رواج نہ رہا ہو، اسے دین سمجھ کر کرنا بدعت کہلاتا ہے۔(عمدۃ القاری:۳۵۶/۵)

رسول اللہ ﷺ نے بدعت سے سخت نفرت کا اظہار فرمایا ہے، ارشاد ہوا:''من احدث فی امرنا هذا ما ليس منه فهو رد وقال ابن عيسٰى قال النبى صلى الله عليه وسلم من صنع امراً على غير امرنا فهو رد '' (سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ باب فی لزوم السنۃ: ۴۶۰۶)'' جس نے ہمارے دین میں کوئی نئی بات نکالی یا ایجاد کی تو وہ مردود ہوگی''۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ احداث اور ہر نئی چیز بُری نہیں؛ بلکہ وہ نئی چیز بُری ہے، جو دین اسلام میں دین سمجھ کر کیا جائے ، بدعت سے آپ ﷺ نے سخت نفرت کا اظہار اس لئے فرمایا کہ دین اسلام مکمل ہو چکا ہے اور دین میں کوئی گوشہ تشنہ نہیں رہا، بدعت کے ذریعہ اس کی نفی ہوتی ہے اور انکار ہوتا ہے کہ دین میں کوئی گوشہ تشنہ رہ گیا اور نعوذ باللہ، رسول اللہ ﷺ نے اس تعلق سے رہنمائی نہیں فرمائی۔

عید میلاد النبی ﷺ کا مسئلہ ایسا ہی ہے، فی زمانہ موجودہ شکل میں عید میلاد النبی منانے کا رواج اسلام کے ابتدائی چھ صدیوں تک نہیں رہا، نہ حضور کے زمانہ میں اور نہ صحابہ وتابعین کے زمانہ میں اس کے منانے کا ثبوت ملتا ہے، ان حضرات سے بڑا عاشق رسول اور کون ہوسکتا ہے؟ لیکن انھوں نے موجودہ یا کسی بھی صورت عید میلاد النبی نہیں منایا، اس کے بعد اور دین میں نئی چیز پیدا کرنے کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوسکتی ہے۔

ہمارا ایمان اور ایقان ہے کہ آنحضرت ﷺ کا ذکر خیر ایک عبادت ہے اور ایمان کی روح ہے، آپ ﷺ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ہمارے لئے اور پوری انسانیت کے لئے مشعل راہ اور بہترین اُسوہ ہے، آپ ﷺ کی ایک ایک ادا کو ذکر کرنا اور مذاکرہ کرنا اور عملی زندگی میں اس کو اختیار کرنا اور اس کی دعوت دینا فرض ہے؛ لیکن اس کے لئے صرف ربیع الاول کا مہینہ مخصوص نہیں، سال کے کسی بھی مہینہ میں ایسی مجلس منعقد کی جاسکتی ہے، محفلیں سجائی جاسکتی ہیں؛ لیکن شریعت میں جس عمل کا کوئی وقت مقرر نہ ہو اس کے لئے وقت مقرر کر لینا اس عمل کو بدعت بنا دیتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ موجود مروجہ صورت میں میلاد کی محفلیں حدیث، آثار صحابہ، تابعین تبع تابعین اور ائمہ عظام متبوعین سے ثابت نہیں، ان تفصیلات کی روشنی میں آپ کے سوالات کا جواب حسب ذیل ہے :

(۱) آنحضرت ﷺ کی سیرت طیبہ کے ذکر کے دوطریقے ہیں، ایک تو یہ کہ آپ کی سیرت کو اس طرح عملی صورت دی جائے کہ آپ کا ہر اُمتی، اخلاق، کردار، صورت وسیرت اور ظاہر و باطن کے اعتبار سے آپ ﷺ کی سیرت کا عملی نمونہ بن جائے۔

(۲) دوسرا طریقہ یہ کہ جہاں بھی اور جب بھی موقع ملے آپ کے ذکر مبارک سے مجلس کو معمور و معطر کیا جائے، آپ کے فضائل وکمالات کا تذکرہ کیا جائے، اور یہ ہوگا عمل کے ارادہ سے اپنی زندگی کو سیرت کا عملی نمونہ بنانے سے۔

آج صورت حال یہ ہے کہ میلاد کے نام پر راتوں کو دیر تک جلسے کر کے اپنے اور غیروں کی نیند میں خلل ڈالا جاتا ہے، دیر تک باجے بجانا عام معمول ہے اور کہتے ہیں کہ ہم نے آنحضرت ﷺ کا حق ادا کر دیا؛ جب کہ ان کی زندگی میں دُور دُور تک اصلاح نام کی چیز نہیں ہوتی۔

(۳) کھانا کھلایا جاسکتا ہے؛ لیکن تاریخ کا تعیین کئے بغیر کھلایا جائے، وہ بھی غریبوں کو۔

(۴) میلاد النبی کی حقیقی خوشی اسی وقت مل سکتی ہے جب آپ ﷺ کی صفت وسیرت اور اخلاق و کردار کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالا جائے اور یہ ہر مسلمان کا حق ہی نہیں؛ بلکہ ہر مسلمان کا فریضہ ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی اور خوشی نہیں ہوسکتی۔

(۵) نبی ﷺ کی زندگی کے حالات سن کر اس کے مطابق اپنے زندگی کو ڈھال کر مسرت اور خوشی منائی جاسکتی ہے۔

(۶) یہ اہل علم کا مسئلہ ہے، عوام کو اس سے کوئی لینا دینا نہیں، عوام مسائل میں اہل حق علماء سے پوچھ کر عمل کریں ۔

(۷) فجر اور عصر کی نماز کے بعد قرآن وحدیث کا درس مبارک عمل ہے، اس میں بیٹھنا چاہئے؛ لیکن اس کے بعد مصافحہ ثابت نہیں، علامہ شامی نے اس کو بدعت لکھا ہے؛ لیکن اگر کسی مسجد میں معمول چلا آرہا ہے تو اس کو فتنہ کا سبب نہیں بنانا چاہئے، بالخصوص جو چیز پہلے سے چلی آرہی ہو۔

(۸) تفسیر بیان کرنے والے صاحب کا طرز عمل غلط ہے، اگر وہ ایک وقت مصافحہ کا رواج ترک کر سکتے ہیں تو دوسرے وقت بھی مصافحہ کا رواج ترک کر سکتے ہیں، واللہ اعلم بالصواب۔

ہبہ کی ہوئی زمین میں دیگر وارثین کا مطالبہ

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ محترمہ سلیم بی صاحبہ زوجہ جناب محبوب علی صاحب مرحوم کا انتقال بتاریخ ۳/اپریل ۲۰۱۱ء کو ہوا اور ورثاء میں ایک لڑکا احمد علی اور چار لڑکیاں: سلطانہ بیگم، حمیدہ بیگم، حنیفہ بیگم، عابدہ بیگم ہیں، مرحومہ نے اپنی زندگی میں اپنی ملکیت بیس مربع گز پر مشتمل ایک مکان جو دو منزلہ تعمیر کر کے دو لڑکیوں: حنیفہ بیگم اور عابدہ بیگم کو قبضہ کے ساتھ بطور سند ایک کاغذ پر لکھ کر دے دیا اور خود گھر کے بازو میں مسجد عالیہ بیگم نامپلی کے تحت ایک مکان میں بطور کرایہ دار اپنے لڑکے احمد کے ساتھ زندگی کے آخری سفر تک رہی اور اب اسی مکان میں کرایہ ادا کرتے ہوئے لڑکا اپنی زندگی بسر کر رہا ہے، کاغذات کی کاپی منسلک کر رہی ہوں مرحومہ کا لڑکا اور تینوں لڑکیاں ان کے فیصلے سے واقف اور متفق ہیں۔

مرحومہ کی بڑی لڑکی سلطانہ بیگم کا مطالبہ ہے کہ مکان میں ترکہ چاہئے، کیا ان کا مطالبہ درست ہے؟ بینک میں قریب دس ہزار روپے تک ہیں، مندرجہ بالا تحریر اور کاغذات کی روشنی میں شرعاً کیا حکم ہے اور رقم میں کس کا کیا حصہ ہے؟ جواب عنایت فرمائیں تو عین نوازش ہوگی۔ (حمیدہ بیگم، لنگم پلی)

جواب:- ہبہ (Gift) مکمل ہونے کے لئے ضروری ہے کہ جس کو ہبہ کیا گیا ہو، سامان ہبہ اس کے قبضہ وتصرف میں دے دیا جائے، ہندیہ میں ہے: ''**ولا یتم حکم الھبۃ الا مقبوضۃ**''۔ (ہندیہ: ۴/۳۷۷)

آپ نے جو صورت پوچھی ہے اور اس کے لئے جو ڈاکیومنٹ منسلک کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحومہ نے ۲۰/گز زمین ہبہ کر کے دو بیٹیوں (حنیفہ اور عابدہ) کے قبضہ وتصرف میں دے دیا، اگر یہ صحیح ہے تو یہ ہبہ مکمل ہے، یہ صرف ان دو بیٹیوں کا ہی حصہ ہے، یہ ترکہ میں شمار نہیں ہوگا کہ دیگر وارثین کا کوئی حق اس میں ہو؛ البتہ جو نقد رقم بینک میں جمع شدہ ہے، وہ ترکہ ہے اور اس میں تمام وارثین کا حق ہے، واللہ اعلم۔

شوہر کی جائیداد میں بیوی کا حصہ

سوال:- عرض یہ ہے کہ میں ایک بیوہ عورت ہوں، میری شادی ایک عمر دراز شخص سے ہوئی تھی، جن کے پہلے سے چھ جوان جوان بیٹے اور بیٹیاں موجود ہیں، ان سب کی

شادیاں ہوچکی ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ میرے شوہر کے وصال کے بعد میرے سبھی سوتیلے بچوں کا کہنا ہے کہ اب تمہارا ہماری جائیداد میں کوئی حق نہیں ہے، بینک بیلنس وغیرہ جو بھی رقم تھی، وہ سب ان کے قبضے میں ہیں، شاہین نگر میں دوسوگز کے پلاٹ پر ایک مکان بنا ہوا ہے، جس کے بارے میں میری شادی (نکاح) کے وقت یہ بات طے ہوئی تھی کہ یہ مکان میرے نام پر کر دیا جائے گا؛ لیکن میرے والد اور بھائیوں کی کوتاہی کی وجہ سے یہ مکان میرے نام پر منتقل نہیں ہوئی اور اب میرے سوتیلے بچوں کا کہنا ہے کہ یہ مکان ان کی حقیقی والدہ کے نام پر ہے، اس شوہر سے میری ایک سات سال کی بیٹی بھی ہے، تو شریعت کے لحاظ سے ہمارا کیا حق بنتا ہے؟ (ایک دینی بہن، ایرہ کنٹہ)

جواب:- میت کے مال سے تمام بیوی، بچوں کا حق متعلق ہوجاتا ہے، چاہے پہلی بیوی سے ہوں یا دوسری بیوی سے، بشرطیکہ وہ جائیداد شوہر کے نام پر ہو، اگر دوسرے کے نام پر ہو اور قانونی مجبوری کی وجہ سے بیوی یا کسی رشتہ دار کے نام رجسٹری کر دی گئی، اور اس سلسلہ میں کوئی صراحت بھی نہ ہو کہ رجسٹری ہبہ کی وجہ سے کی گئی ہے تو ایسی صورت میں اس جائیداد سے تمام ورثہ کا حق متعلق ہوتا ہے۔

آپ نے جو صورت پوچھی ہے اس میں اگر مرحوم شوہر نے پہلی بیوی کے نام برائے نام رجسٹری کیا تھا، مکمل طور پر ہبہ کرنے کا ارادہ نہیں تھا، قانونی دشواری سے بچنے کے لئے ایسا کیا تھا، تو اس میں آپ کا، آپ کی بیٹی کا اور تمام سوتیلی اولاد کا حصہ ہے، آپ کے سوتیلے بیٹوں کو چاہئے کہ آخرت کی پکڑ سے بچنے کے لئے تمام ورثہ کو ان کا حق دے دیں، جس میں آپ کا اور آپ کی بچی کا بھی حصہ ہے، واللہ اعلم۔

بوقت نکاح نام کی صراحت میں معمولی غلطی

سوال:- کیا فرماتے ہیں مفتیانِ دین شرح متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی ہمشیرہ کا نکاح ایک جگہ طے کیا اور بایوڈاٹا میں اپنا نام محمد اسحاق اور والد کا نام محمد اظہر ظاہر کیا؛ لیکن جب نکاح نامہ دیکھا گیا تو اس میں اسحاق بیگ اور اظہر بیگ، (بیگ کے اضافہ کے ساتھ) تھا؛ چنانچہ قبل از نکاح پورا نام ظاہر کرنا اس شخص پر ضروری تھا یا نہیں؟ رہنمائی فرمائیں۔ (محمد سہیل، ٹولی چوکی)

جواب:- نکاح صحیح ہونے کے لئے لڑکا یا لڑکی کا معلوم ومتعین ہونا کافی ہے، نام میں اگر معمولی غلطی ہوجائے؛ لیکن لڑکا وہی ہو تو اس سے نکاح کے صحیح ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا؛ چنانچہ شامی میں ہے: "**لو کانت**

مشاراً الیها وغلط فی اسم ابیها أو اسمها لا یضر ، لان تعریف الاشارة الحسیة اقوی من التسمیة''(شامی:۴/۹۷)اس لئے اگر بایوڈاٹا میں''بیگ'' لکھا ہوانہیں تھااور نکاح کے وقت''بیگ'' لکھا گیاتواس سے نکاح کی صحت پرکوئی فرق نہیں پڑا،نکاح صحیح ہوگیا،ویسے بھی''بیگ''اصل نام نہیں ہوتا؛بلکہ اس سے صرف خاندانی نسبت ظاہر ہوتی ہے،واللہ اعلم۔

● ● ●

خبر نامہ
المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

مولانا عبید اختر رحمانی ☆

☆ ۲۶؍شوال المکرم ۱۴۳۹ھ، مطابق: ۱۱؍جولائی ۲۰۱۸ء کو المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد میں نئے تعلیمی سال کا آغاز ہوا، تعلیمی سال کے آغاز پر ایک افتتاحی تقریب منعقد کی گئی، جس میں حضرت ناظم صاحب اساتذہ معہد اور طلبہ شریک ہوئے، افتتاحی اجلاس کے مہمان خصوصی مشہور صاحب طریقت حضرت مولانا منیر احمد صاحب تھے، آپ نے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے دینی تعلیم کے مقصد اور غرض وغایت پر تفصیلی روشنی ڈالی اور علم کے ساتھ عشق یعنی دماغ کے ساتھ دل کی دنیا کو آباد کرنے پر بھی زور دیا، اس افتتاحی اجلاس میں حضرت ناظم صاحب نے علم دین کی اہمیت وعظمت اور اس کے حصول کے لئے مطلوبہ ادب پر خطاب کیا اور بتایا کہ موجودہ دین بیزار دور میں دین کی حفاظت واشاعت کا یہ کارِ شیشہ وآہن کس طرح انجام دیا جاسکتا ہے؟ اس موقع سے اساتذۂ معہد نے بھی خطاب کیا اور معہد کے علمی معیار اور یہاں کے قواعد وضوابط سے آگاہ کرتے ہوئے طلبہ کو ان کی پابندی کی تاکید کی۔

☆ ۲۷؍شوال تا ۵؍ذوالقعدہ ۱۴۳۹ھ، مطابق: ۱۲-۱۹؍جولائی ۲۰۱۸ء کو المعہد العالی الاسلامی میں اساتذہ کرام کے محاضرات ہوئے، مولانا اشرف علی قاسمی نے ''قرآن کریم — تاریخ وتدوین'' کے موضوع پر محاضرہ دیا، مولانا محمد عمر عابدین قاسمی مدنی نے ''اُصول تخریج اور دراسۃ اسانید'' کے موضوع پر محاضرہ دیا، ''فقہ اسلامی — تاریخ وتدوین'' کے موضوع پر مولانا شاہد علی قاسمی نے محاضرہ دیا، مولانا محمد اعظم ندوی نے ''فقہ کے اہم ماخذ اور ان کے امتیازات'' اور ''خود اعتمادی — کامیابی کی کلید'' کے موضوع پر محاضرہ دیا، مولانا ناظر انور قاسمی نے ''جغرافیۂ عالم'' کے موضوع پر طلبہ کو محاضرہ دیا۔

☆ یکم ذوالقعدہ ۱۴۳۹ھ، مطابق: ۱۵؍جولائی ۲۰۱۸ء کو دہلی میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے عاملہ کی میٹنگ ہوئی، جس میں حضرت ناظم صاحب بھی شریک ہوئے۔

☆ نگراں شعبۂ تحقیق: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

☆ ۲؍ذوالقعدہ ۱۴۳۹ھ، مطابق: ۱۶؍جولائی ۲۰۱۸ء کو قنوج میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے تحت دار القضاء کا قیام عمل میں آیا، اس موقع سے ایک اجلاس کا اہتمام کیا گیا تھا، جس کی صدارت حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے فرمائی۔

☆ ۸؍ذوالقعدہ ۱۴۳۹ھ، مطابق: ۲۲؍جولائی ۲۰۱۸ء کو تلگو آڈیٹوریم حیدرآباد میں ۱۰ تا ۱؍بجے مسلم پرسنل لا سے متعلق کلاس کا انعقاد ہوا، اس پروگرام کی صدارت حضرت مولانا رحمانی نے فرمائی اور کلاس پروفیسر محترمہ قدوسہ سلطانہ صاحبہ نے لیا۔

☆ ۸؍ذوالقعدہ ۱۴۳۹ھ، مطابق: ۲۲؍جولائی ۲۰۱۸ء کو جناب علیم الدین خان فلکی صاحب کی مروجہ جہیز کے خلاف تصنیف کی رسم اجراء کی تقریب بھی تھی، اس تقریب میں حضرت مولانا ہاتھوں اس کتاب کی رسم اجراء انجام پائی۔

☆ ۱۴؍ذوالقعدہ ۱۴۳۹ھ، مطابق: ۲۸؍جولائی ۲۰۱۸ء کو حضرت مولانا نے دار العلوم لوناواڑہ میں ''ادب اختلاف'' کے موضوع پر علماء سے خطاب کیا۔

☆ ۱۵؍ذوالقعدہ ۱۴۳۹ھ، مطابق: ۲۹؍جولائی ۲۰۱۸ء کو لوناواڑہ شہر میں ہی حضرت مولانا نے تاجروں کے ایک اجتماع سے خطاب کیا اور دُورِ حاضر کے تجارتی مسائل پر ان کی شرعی رہنمائی فرمائی۔

☆ ۱۶-۱۸؍ذوالقعدہ ۱۴۳۹ھ، مطابق: ۳۰؍جولائی تا یکم اگست ۲۰۱۸ء کو حضرت مولانا ڈابھیل تشریف لے گئے اور علماء کے لئے فکری تربیتی محاضرات دیئے۔

☆ ۱۹-۲۱؍ذوالقعدہ ۱۴۳۹ھ، مطابق: ۲-۴؍اگست ۲۰۱۸ء کو معہد میں دعوہ تربیتی کیمپ کا انعقاد عمل میں آیا، اس تربیتی کیمپ سے مولانا عبدالماجد صاحب نے خطاب کیا، طلبہ کو اس کیمپ سے بڑا نفع محسوس ہوا۔

☆ ۲۳-۲۴؍ذوالقعدہ ۱۴۳۹ھ، مطابق: ۸-۹؍اگست ۲۰۱۸ء کو حضرت مولانا رحمانی دار العلوم وقف دیوبند تشریف لے گئے، جہاں حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحبؒ کی یاد میں ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا تھا، سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں مولانا رحمانی نے حضرت مولانا محمد سالم صاحبؒ کی شخصیت پر خطاب کیا اور ایک نشست کی صدارت بھی فرمائی، اس سیمینار میں معہد کے دو اساتذہ مولانا محمد اعظم ندوی اور مولانا محمد عمر عابدین قاسمی مدنی نے بھی شرکت کی، مولانا ندوی نے مقالہ پیش کیا اور مولانا مدنی نے ایک نشست کی نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

☆ ۲۶-۲۷؍ذوالقعدہ ۱۴۳۹ھ، مطابق: ۱۱-۱۲؍اگست ۲۰۱۸ء کو حضرت مولانا کنڈلور (کرناٹک) تشریف لے گئے، جہاں مجمع الامام الشافعی العالمی پر منعقد ہونے والی مشاورتی نشست کی صدارت فرمائی۔

☆ ۷-۱۵/ذوالحجہ ۱۴۳۹ھ، مطابق: ۱۹-۲۷/اگست ۲۰۱۸ء کو معہد میں عید الاضحیٰ کی تعطیل رہی اور بقرعید کے موقع سے اجتماعی قربانی کا نظم کیا گیا۔

☆ ۱۴/ذوالحجہ ۱۴۳۹ھ، مطابق: ۲۶/اگست ۲۰۱۸ء کو بنگلور کے ایک وفد کی حضرت مولانا سے ملاقات کے لئے المعہد العالی الاسلامی آمد ہوئی، وفد نے نظام مساجد کے تعلق سے کچھ سوالات پیش کئے اور شرعی رہنمائی کی درخواست کی۔

☆ ۱۶/ذوالحجہ ۱۴۳۹ھ، مطابق: ۲۸/اگست کو مشہور وکیل محترمہ راشدہ شبنم (ممبئ) بعض اُمور پر حضرت مولانا سے مشورہ کے لئے معہد تشریف لائیں۔

☆ ۲۰-۲۲/ذوالحجہ ۱۴۳۹ھ، مطابق: ۱-۳/ستمبر ۲۰۱۸ء کو المعہد العالی الاسلامی میں تربیت قضاء کیمپ منعقد ہوا، قاضی شریعت دار القضاء ممبئ قاضی محمد فیاض عالم قاسمی اس کیمپ کے مربی اور مقرر خصوصی تھے، اس تربیتی کیمپ میں طلبہ کو اُمور قضا بالخصوص فصل مقدمات اور شہادت وگواہی قبول کرنے کے طریقہ کار وغیرہ کی عملی مشق کرائی گئی، سہ روزہ تربیتی کیمپ کے اختتام پر طلبہ کا تحریری امتحان بھی لیا گیا۔

☆ ۲۱/ذوالحجہ ۱۴۳۹ھ، مطابق: ۲/ستمبر ۲۰۱۸ء کو حضرت مولانا آئی او ایس (دہلی) کی ایک میٹنگ میں شریک ہوئے۔

☆ ۲۲/ذوالحجہ ۱۴۳۹ھ، مطابق: ۳/ستمبر ۲۰۱۸ء کو دہلی میں تہذیب اسلامی کورس کا ایک روزہ ورکشاپ منعقد ہوا اس ورکشاپ میں حضرت مولانا نے شرکت فرمائی اور خطاب کیا۔

☆ ۲۳-۲۴/ذوالحجہ ۱۴۳۹ھ، مطابق: ۴-۵/ستمبر ۲۰۱۸ء کو معہد میں حضرت مولانا نے طلبہ کو ''ادب اختلاف'' پر محاضرہ دیا۔

☆ ۲۵/ذوالحجہ ۱۴۳۹ھ، مطابق: ۶/ستمبر ۲۰۱۸ء کو تلنگانہ حکومت کے تحت چلنے والے اقلیتی اسکولوں کے نصاب کے سلسلے میں جناب عبد القیوم خاں صاحب نے ایک میٹنگ کا انعقاد کیا تھا، ان کی دعوت پر حضرت مولانا اس میٹنگ میں شریک ہوئے اور مشورے دیئے۔

☆ ۲۵/ذوالحجہ ۱۴۳۹ھ، مطابق: ۶/ستمبر ۲۰۱۸ء کو بعد نماز ظہر مجلس علمیہ کے ایک مشاورتی اجلاس میں حضرت مولانا شریک ہوئے۔

☆ ۲۷/ذوالحجہ ۱۴۳۹ھ، مطابق: ۸/ستمبر ۲۰۱۸ء کو بعض اُمور پر مشورہ اور شرعی رہنمائی کے سلسلے میں ممبئ کے ایک وفد کی المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد میں آمد ہوئی اور مولانا نے ان کی رہنمائی فرمائی۔

☆ ۲۸ / ذوالحجہ ۱۴۳۹ھ، مطابق ۹ / ستمبر ۲۰۱۸ء کو اندور کے جامعہ صدیقیہ میں ختم نبوت کے اجلاس میں حضرت مولانا شریک ہوئے اور علماء کے خصوصی نیز عوامی پروگراموں کی صدارت فرمائی۔

☆ ۲۹ / ذوالحجہ ۱۴۳۹ھ، مطابق: ۱۰ / ستمبر ۲۰۱۸ء کو معہد کے ایک اہم شعبہ ''تاھیل القیادۃ'' کے طلبہ کا پروگرام منعقد ہوا، جس میں آر ایس ایس کی تاریخ اور اس کے طریقۂ کار پر تفصیل سے مذاکرہ ہوا۔

● ● ●

المعهد العالی الاسلامی حیدرآباد - ایک نظر میں!

☐ قیام :	• شوال المکرم ۱۴۲۰ھ، مطابق جنوری ۲۰۰۰ء
☐ مقاصد :	• مختلف علوم اسلامی میں افراد کار کی تیاری • زمانہ شناس داعیوں کی تربیت • علماء کو انگریزی زبان اور جدید علوم سے باخبر کرنا • تحقیق وتالیف • عصری تعلیم یافتہ حضرات کیلئے دینی تعلیم کا نظم۔
☐ شعبہ جات :	**تخصصات** • تخصص فی علوم القرآن • تخصص فی علوم الحدیث • تخصص فی الفقہ والافتاء • تخصص فی الدعوۃ واللغۃ • تربیت اسلامک فائنانس (اسلامک بینکنگ، اسلامک انشورنس، اسٹاک ایکسچینج) • تدریب تحقیق وتالیف • شعبہ مطالعۂ مذاہب **شعبۂ تحقیق** • ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ چیئر • مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ چیئر **مختصر مدتی عالم کورس برائے عصری مدارس** • مدرسہ عبد اللہ بن مسعودؓ (رین بازار، حیدرآباد) • مدرسہ تعلیم القرآن (ناگپور) • مدرسۃ البنات (حافظ بابانگر) **شعبۂ دعوت** • سنٹر فار پیس اینڈ ٹرو میسیج • ستیہ پرکاش (سوشل میڈیا برائے تعارف اسلام) **دیگر شعبہ جات** • دار الافتاء • نشر واشاعت • کتب خانہ • ڈیجیٹل لائبریری • ویب سائٹ
☐ مختلف شعبوں کے فارغین :	۱۱۳۴
☐ مختلف شعبوں سے استفادہ کرنے والے فضلاء اور طلبہ وطالبات :	تقریباً ساڑھے تین ہزار
☐ اب تک جتنے موضوعات پر علمی وتحقیقی کام ہوئے ہیں :	۲۵۰ (صفحات: تقریباً ایک لاکھ)

المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کی فکر اور اس کا مسلک

- اہل سنت والجماعت کے معتبر شارحین کی آراء پر استقامت۔
- اشاعرہ، ماتریدیہ اور حنابلہ، تینوں مکاتبِ فکر کا احترام۔
- عقیدۂ توحید میں ان تشریحات کی پابندی جو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے اختیار فرمائی ہے۔
- سلفِ صالحین کے درمیان اعتقادی وفروعی مسائل میں جو اختلاف رائے رہا ہے، اس میں توسع اور ولی اللہی طرزِ فکر کی پیروی۔
- اہل قبلہ میں سے کسی گروہ کو کافر یا فاسق قرار دینے میں خوب احتیاط۔
- مخالف نقطۂ نظر کے مقابلہ میں تحمل، اختلاف رائے کے باجود احترام اور ملت کے مشترکہ مسائل کے لئے اشتراک۔
- علومِ ظاہری کے ساتھ ساتھ تزکیہ واحسان کی جامعیت۔
- برادرانِ وطن میں دعوتِ دین اور دفاعِ اسلام کی طرف خصوصی توجہ۔
- زبان وبیان اور سلوک ورویہ میں اعتدال۔
- مناظرہ اور طنز وتشنیع کی بجائے نصح ومحبت کے ساتھ اصلاح ودعوت۔

● ● ●

شمارہ نمبر: ۱۳، جولائی۔ستمبر ۲۰۱۸ء

المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد اعلیٰ دینی تعلیم کا ممتاز ادارہ ہے، ہر سال طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد اور مسجد کی تنگ دامنی کو دیکھتے ہوئے مسجد کی توسیع کا فیصلہ کیا گیا ہے، فی الوقت یہاں دو سو علماء کرام زیر تعلیم ہیں اور پنج وقتہ نماز ادا کرتے ہیں، اصحابِ خیر سے گزارش ہے کہ وہ مسجد کی تعمیر میں شرکت فرمائیں۔

Al- Alam Urdu Computers Hyd. +91 9959897621

RNI No: 1219775, RNI Tile-Code: APURD01946